

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

آتش اقبال آید

READING

Section



جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

انتساب

اپنے
اکھوتے بیٹے
خرم
کے نام
جو مجھے
اپنی جان سے زیادہ
عزیز ہے

سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔

2006ء

ارسلان بک کارپوریشن

ہم کتاب _____ اکیلا

مصنفہ _____ اشاقان احمد

کہو رنگ _____ سید اویس قرنی جنگی سٹریٹ قصہ خوانی پشاور

مطبع _____ آصف یسین پریس، لاہور

تعداد _____ 600

قیمت _____ 150/- روپے

اشاقان

طیبنہ بکسٹال
پبلسٹریز اینڈ بک سیلز
Ph. 7320318
0301-4072442
الحمد للہ تعالیٰ سٹریٹ اردو بازار لاہور پاکستان

READING
Station

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

انتساب

اپنے
اکلوتے بیٹے
خرم
کے نام
جو مجھے
اپنی جان سے زیادہ
عزیز ہے

سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔

2006ء

ارسلان بک کارپوریشن

نام کتاب اکیلا

مصنف اشفاق احمد

کمپوزنگ سید اویس قرنی جنگل سٹریٹ قصہ خوانی پشاور

مطبع آصف بیسین پریس، لاہور

تعداد 600

قیمت 150/- روپے

اسٹاکسٹ

Ph. 7320318
0301-4072442
پبلسٹریز اینڈ بک سیلز
انٹرنیشنل ٹریڈ سروسز اور وہاٹس ایپ: اور پاکستان

طلیخہ بک سٹال

READING
Station

”آپ اپنی سوتیلی بہن کے قتل کے الزام سے بری ہو گئے ہیں آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

”آپ یورپ سے آئے، آتے ہی اپنے والد کا وصیت نامہ دیکھنے کے دو دن بعد ہی آپکی بہن سمینہ کا قتل ہوا۔ اس میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”آپ اس ملک کے نامی گرامی شخصیت ہیں کیا یہ قتل کا الزام آپکی شہرت کو بدنام کرنے کی سازش تو نہیں؟“

کورٹ سے باہر نکل کر صحافیوں اور لوگوں کے ہجوم کو چیرتا وہ اپنی بڑی سی سیاہ قیمتی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کیمروں کی چکا چوند میں اس سے مختلف سوالات پوچھے جا رہے تھے۔ اسکے چہرے پر تھکن تھی، الجھن تھی، بیزاری تھی۔

”کیا آپ نے واقعی یہ قتل نہیں کیا؟“ یہ ایک نسوانی آواز تھی۔ طنز اور حقارت لئے۔ ”کیا واقعی آپ بے گناہ ہیں یا آپکی بے پناہ دولت آپکو بے گناہ ثابت کرنے میں معاون ہوئی ہے؟“ اسکا شو فراس کیلئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولے اسکا منظر کھڑا تھا۔

”آپکی چپ کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہ قتل آپ نے ہی کیا ہے۔“ وہی آواز تھی۔ زہرا گلتے ہوئے گاڑی تک اسکا پیچھا کر رہی تھی۔

اور وہ شاید مزید برداشت نہ کر سکا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر ہی اسے بازو سے پرے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ کر گاڑی میں جا بیٹھا۔

بیچ دتا بکھاتی دھنک اسکی گاڑی کے پیچھے لگے نمبر پلیٹ کو کھتی رہ گئی۔ کئی مہینے سے وہ اس کیس کی کارروائی نوٹ کر رہی تھی۔ بلکہ وہ خود ہر دفعہ کورٹ جاتی۔

’وہم کہاں سے دور دور یقین کی حد کے پاس پاس
دل کو بھرم یہ ہو گیا ان کو ہم سے پیار ہے‘

جج نے مسٹر عالم کو کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملنے پر بری کر دیا تھا۔ ہونہا اس نے کروٹ بدلی۔
ثبوت ٹھوس نہ سہی، مسٹر ظفر عالم کی بے پناہ دولت ضرور ٹھوس تھی۔ جس نے قانون تک کو خرید
لیا تھا۔

اسے پورا یقین تھا وہ ہی قاتل تھا۔ باپ کے وصیت نامے کے مطابق کروڑوں اربوں کی
املاک میں وہ اپنی سوتیلی بہن کو شریک نہ دیکھ سکتا تھا۔ دو ہی دن بعد اسے قتل کر دیا۔ چاقو سے۔
یہ الگ بات تھی کہ اسکے فنگر پرنٹس چاقو پر موجود نہیں تھے۔ اتنا ہی قوف وہ لگ بھی نہیں رہا تھا
کہ پرنٹس چھوڑتا۔

لبے قد، چمڑے شانے، پرکشش نقوش اور ذہین آنکھوں والے تیس بیس سالہ اس
فحص سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔ کسی کی زندگی کی اسکی نظروں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ اسے
معلوم تھا اسکی دولت قانون کو خرید لے گی۔

وہ ایک جرنلسٹ تھی۔ ایک ہفتہ وار میگزین 'آئینہ' کی رپورٹر تھی۔ جو اپنی صاف ستھری
صحافت اور دلچسپ اشاعت کیلئے مشہور تھا۔

تھکے تھکے قدم اٹھاتی کندھے سے بیک لٹکائے وہ بس سناپ پر آکھڑی ہوئی۔
وہ ایک عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ والد دوسرے شہر میں یونیورسٹی میں انگلش
ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین تھے۔ والدہ بھی وہیں سائیکولوجی کی پروفیسر تھیں۔ دو بہنیں اور تھیں۔
ابھی پڑھ رہی تھیں۔ ایک بی اے کے آخری سال میں دوسری ایف اے کر چکی تھی۔ بھائی کوئی
نہیں تھا۔ منگ خود یہاں ایک لڑکی فرزانہ کیساتھ ایک چھوٹے سے صاف ستھرے دو بیڈروم
کے فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ فرزانہ مقامی کالج میں پیکچر تھی۔ ابھی لڑکی تھی۔ دونوں میں خاصی
بے تعلق تھی۔

سوجھ میں کوئی وہ بس میں جا بیٹھی۔ یہ بس سیدھی ان فلیٹس کے آگے سے گزرتی تھی
جہاں منگ تمام پڑھ رہی تھی۔ گیٹ پر اتر کر وہ جلدی جلدی فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
فرزانہ بھی نہیں آئی تھی۔ کچن میں ہی چند نوالے لے کر وہ اپنے بیڈروم میں آئی اور بستر
پر پڑھی۔ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی مگر۔ بے سود۔ وہ کراسکے ذہن میں کورٹ
کی آج کی کارروائی گھوم رہی تھی۔

”تو ہونے دو۔ ہمیں کیا۔“

”نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔“

”تو پھر کیا ہوگا؟“ وہ مسکرایا۔

”اسے اندر ہونا چاہیے۔ پھانسی لٹی چاہیے یا مر قید۔ گل سڑ جائے جیل کے اندر ہی۔“ وہ عمارت سے کہہ رہی تھی۔

”تم کیوں اسکے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہو۔ کورٹ نے فیصلہ دے دیا بس دے دیا۔ ضروری ہے بہن قتل ہوئی تو بھائی بھی ختم ہو۔ کہاں کا انصاف ہے یہ۔“ وہ اسے چراتے ہوئے بولا۔

”انصاف!“ وہ جیسے خود سے بولی۔ ”انصاف تو ہونا ہی چاہیے۔“ اس نے اپنے کاغذ تہہ کئے، بیگ میں رکھے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”کام ہے ذرا۔“

وہ سیدھی ادھیڑ عمر چیف ایڈیٹر اشفاق صاحب کے آفس میں آگئی۔ اشفاق صاحب اور دھنگ کے ابو رباض احمد پڑھائی کے دوران ایک ہی ہوٹل میں رہتے تھے۔ بڑی دوستی تھی آپس میں۔ بعد میں اشفاق صاحب نے صحافت سنبھال لی اور اسکے ابو کالج میں لیکچرر ہو گئے۔ وقت گزرتا رہا۔ دونوں کو تھے الگ الگ شہروں میں مگر دوستی میں فرق نہیں آیا۔ اب بھی آتے جاتے تھے۔ اب بھی ملنا جلتا تھا۔ بلکہ اشفاق صاحب کے ہی سہارے تو انہوں نے دھنگ کو جرنلسٹ بننے اور انکے پاس کام کرنے کی اجازت دی تھی۔ ورنہ نہ ابو اس پیشے کے حق میں تھے اور نہ ہی اشفاق صاحب۔

ابو تو اسکی ضد کے آگے مجبور ہو گئے۔ مگر اشفاق صاحب اکثر مشورہ دیتے۔

”میری ماں بیٹی تو گھر سا داپنا۔ شادی کر لو۔ یہ جان جو کموں کے کام تمہارے بس کے نہیں۔“

وہ بہت خوبصورت تھی۔ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بہت بھونک بھونک کر قدم رکھنا

اگلے روز وہ اپنی معمول کی ڈیوٹی میں مگن تھی۔ ڈیسک پر بیٹھی ایک رپورٹ کے کاغذات کو تیب سے دیکھ رہی تھی۔ کہ اسکا ساتھی رپورٹر آصف آ پہنچا۔

”ہیلو دھنگ۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔

”ہیلو۔“ اسکی نظریں اب بھی کاغذات پر تھیں۔

”کچھ پتہ بھی ہے تمہارا دشمن کونجی کر گیا ہے اس شہر سے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے چونک کر سناٹھایا۔

”مسٹر فخر عالم کل شام اپنا یہاں والا پتلیں چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں کہیں چلا گیا ہے۔“

”کہیں چلا گیا ہے؟“ اسکی آواز میں حیرت تھی، پھیلی پھیلی آنکھیں شکوک کی غماز۔

”ہاں۔“ لاپرواہی سے کہتا ڈیسک پر بیٹھے ہوئے وہ اپنا بیگ کھولنے لگا۔

”آصف۔“

”ہوں۔“ اسکی نظریں اپنے کام پر تھیں۔

”مسٹر فخر عالم کیا نہیں افرار ہوا ہے۔“ وہ پورے وثوق سے بولی۔

”کیا مطلب؟“

”کورٹ میں وہ میری ضرور ہوا ہے۔ مگر کورٹ سے باہر سب کا ایک ہی رد عمل تھا۔ ایک عیبات تھی ہر زبان پر۔“

”کیا؟“ وہ اب بھر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہا تھا اسکی بات کو۔

”کسی نے مجھ کو قتل ہی نے کیا ہے۔ پیسے کی بدولت چھوٹ گیا ہے۔“

پڑتا ہے۔ معزز اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ باپ کا دوست ہونے کے ناطے انہیں
 اسکی فکر بہر حال رہتی تھی۔ محافت میں کہاں کہاں بھٹکتا پڑتا تھا۔ کسی کو سنائیں تو کسی کی سنی بھی
 پڑتی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دھنک کسی غلط تجربے سے دوچار ہو۔

”کیا بات ہے بیٹا۔“ اشفاق صاحب اسے متفکر سا دیکھ کر خود ہی گویا ہوئے۔

”انگل... سنا ہے مسز فخر عالم یہاں سے کہیں اور چلا گیا ہے...“

”دبی۔ اس مرڈر کیس والا؟“

”جی ہاں نے قدرے توقف کیا۔“ وہ جب سے یورپ سے آیا تھا۔ یہیں رہ رہا

تھا۔ بہت بڑا کاروبار ہے اسکا یہاں۔ یوں اچانک راتوں رات بغیر کسی کو پتہ چلے چل دینا کیا
 گت کی نشاندہی نہیں کرتا؟“

”تو؟“ وہ اب بھی اُنکے کام میں دلچسپی لینے اور معرکہ آرائی کے شوق پر دھیرے سے
 مگر آتے ہوئے بولے۔

وہ چند لمبے کچھ سوچتی رہی۔ پھر آہستہ سے سراٹھایا۔

”انگل میں اس آدمی کا پتہ لگانا چاہتی ہوں۔ میں۔۔۔ اور پھر تقریباً سبھی لوگ اس
 کیس کے فیصلے سے مطمئن نہیں۔ اسکا یوں آسانی سے بری ہو جانا سب کو عجیب لگ رہا ہے
 اور۔۔۔ میرے لئے تو۔۔۔ ایک چیلنج ہے جیسے۔“

انگل آہستہ سے مگر اویئے۔

”بیٹی یہ کام اتنا آسان نہیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے ہم لوگوں نے کتنی کوشش کی اسکا
 اعتراف لینے کی۔ مگر صاف جواب مل جاتا تھا کہ وہ کسی کو اعتراف نہیں دینگا...“

”میں کرونگی اسکا اعتراف۔“ وہ انکی بات کاٹنے ہوئے غلٹ سے بولی۔ اسے یقین تھا
 مسز فخر عالم نے اسے دیکھا نہیں تھا۔

”مشکل ہے۔“

”تو مشکل یہ مشکل کا ماہر خوکون کریگا۔“ وہ ابھری گئی۔

”پولیس۔ قانون کا کام ہے یہ۔“

”صرف پولیس یا قانون کا نہیں ہمارا بھی ہے۔ باہر کے ممالک میں تو رپورٹرز بعض
 وقت پولیس سے زیادہ سرگرمی دکھاتے ہیں۔ زیادہ کھوج میں رہتے ہیں بلکہ پولیس کا کام ہو
 جاتی ہے اور پولیس کامیاب رہتی ہے۔ پولیس، پولیس، قانون سب کو مل کر کام کرنا چاہیے۔
 پولیس کا تعاون تو بہت Count کرتا ہے...“

”اچھا بابا اچھا۔“ وہ لاجواب سے ہو گئے۔ ”لیکن۔۔۔ کسی میل جرنلسٹ پر چھوڑ دو یہ
 کام۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔

”میل جرنلسٹس کیا مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“ اسے انکی بات سے اتفاق نہیں تھا۔
 ”اسکی بات نہیں ہے۔“

وہ اسکی ذہانت، اسکی قابلیت کے قائل تھے۔ وہ جنینیس تھی وہ جانتے تھے۔ پچھلے ڈیڑھ
 سال سے اسے جو بھی اسائنمنٹ ملی تھی، نہایت خوبی سے انجام دی تھی۔ News sense
 تھا اس میں۔ ایکٹو تھی مگر۔۔۔

پچھلے دنوں اسکے ابو اسے ملے تھے تو ایک بار پھر انہوں نے انہیں دھنک کو شادی پر مائل
 کرنے کا کہا تھا۔ جرنلزم اسکا شوق تھا پڑھ چکی تھی مگر وہ اسکی جاب کے خلاف تھے۔ وہ ٹیچنگ
 وغیرہ کرتی تو انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر یہ کام۔۔۔ وہ پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ کسی
 طرح دل نہیں مانتا تھا۔ پھر وہ لڑکی کی بروقت شادی کے حق میں تھے۔ آجکل اس کے رشتے
 بھی آرہے تھے۔ بعد میں شاید ایسا نہ ہوتا۔ دو بیٹیں اور بھی تھیں، جوان تھیں وہ بھی، دھنک
 کی شادی ہو جاتی تو ان کیلئے بھی رستہ کھل جاتا۔

”بیٹی۔ میری ماں تو شادی کر لو۔ تمہارے ابو کی بھی بیٹی خواہش ہے۔“ وہ ایک قائل پر
 نظریں جمائے آہستہ سے بولے۔

وہ جس بھی نظر آنے لگی۔

”شادی کیلئے کافی وقت پڑا ہے نکل۔“ وہ کچھ جھنجھلائی سی بولی۔

"یہی تو وقت لگا جا رہا ہے۔" وہ نامحاند انداز میں بولے۔

"اچھا آپ یہ تو کام کر لینے دیں۔ اسکی تو اجازت دے دیں۔ پھر دیکھا جائیگا..."

"یہ بہت مشکل کام ہے۔ بہت جان جوکھوں والا۔ تم کہاں کہاں بھٹک لو گی۔ کل کو خدا نخواستہ

کوئی بات ہوئی تو ریاض احمد کو کیا جواب دوں گا..."

"کچھ نہیں ہوگا انکل۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔" وہ مسکرائے۔

"اچھا چلیں۔ کوئی مشکل پیش آئی تو واپس آ جاؤ گی۔ اور پھر میں یہاں پر وگرنہ رپورٹ

بھی تو دیتی رہو گی۔"

اشفاق صاحب نے گہری سانس لی۔ جیسے ہار مان لی ہو۔

"ٹھیک ہے۔ میں چیف رپورٹر سے بات کرتا ہوں۔ تم ان سے ملتے ہوئے جانا۔ وہ

تمہارے وہاں جانے اور ٹی اے ڈی اے وغیرہ کا بندوبست کر دیں گے۔ اور ہاں۔ یہ تو بتاؤ اسکا

پتہ کیسے چلاؤ گی۔ کہاں گیا ہے؟ کس طرف نکلا ہے؟ تم کس چیز سے سزا کرو گی؟" انہوں نے

پریشانی سے سر ہلایا۔ "مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے۔ ہمارے ملک میں فیملی صحافت ابھی

اتنی ایڈوانس نہیں ہوئی... کہ اکیلے میں گھومتی پھریں۔" وہ قدرے رکے۔ "تم ایسا کرو

آصف کو ساتھ لے لو۔ انہوں نے فون کارڈ سیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ اتنی چھوٹی موٹی بھی نہیں تھی۔ کہ اکیلے سفر نہ کر پاتی۔ وہ آصف کو بالکل ساتھ نہیں لے

گی۔ وہ تو پہلے ہی اس بات کے خلاف تھا۔ بلکہ سرے سے مسز فخر عالم کو مجرم گردانتا ہی نہیں تھا۔

کوئی بہانہ کر کے وہ آصف کو پیچھے چھوڑ جائیگی۔ آصف نے رکاوٹ ہی بنانا تھا اور کچھ نہیں۔

"ٹھیک ہے انکل۔ سونائیس آف یو۔ ٹھیک یو۔"

اور۔ آفس سے نکل کر چیف رپورٹر کے دفتر کی طرف بیڑھی۔

خوش ذوقی سے بچے اپنے منے سے آرام دہ کلیٹ میں آکر اس نے اپنا ہینڈ بیگ الماری

میں لٹکایا، کپڑے تبدیل کئے، فرج سے کھانا نکال کر گرم کیا، فرزند کا انتظار کئے بغیر ہی کھانا

کھایا اور تھکی تھکی ہی بستر پر لیٹ رہی۔

آنکھیں موندتے ہوئے وہ اس مہم کے مختلف پہلوؤں پر سوچنے لگی۔

فخر عالم کا گھر جسے وہ طنزیہ لہجے میں اسکا محل کہا کرتی تھی اسے معلوم تھا۔ شہر کے

مضافات میں بنا اسکا گھر واقعی کسی محل سے مشابہ تھا۔ سب سے پہلے تو وہ وہاں جانتی۔ کسی

بھی طرح معلوم کر چکی کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اگر وہ چھپ کر گیا ہوگا تو وہاں موجود نوکروں کو

بھی ظاہر ہے نہیں بتایا ہوگا۔ بہر حال۔۔۔ وہ ہر ممکن کوشش کر چکی اس مسئلے کو سلجھانے کی؟

کسی خوش آئند تصور سے اسکی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ وہ دن کتنا خوبصورت ہوگا جب

وہ مسز فخر عالم کو بے نقاب کرے گی۔ پبلک کو دھماکہ خیز انکشاف مہیا کرے گی اور۔۔۔ اور اسکا کتنا

نام ہوگا!

اس نے گہری پر نظر ڈالی۔ شام کے چارج رہے تھے۔ مرد یوں کا آغاز تھا۔ دن گھٹنے لگے

تھے۔ وہ فوراً اٹھی۔ وہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہی مسز فخر عالم

کے سرائخ میں تھی۔ ہو سکتا تھا کسی اور اخبار کسی اور میگزین کا رپورٹر بھی اسی کوشش میں لگا ہو۔

اور یہ۔۔۔ اس نے ہرگز ہرگز نہیں ہونے دینا تھا۔

اس نے الماری میں سے ہینگر میں لٹکا اپنا ڈال گرین پرسفید سفید پھولوں والا ڈریس نکال

کر پہنا۔ ڈال گرین ہی دوپٹہ گلے میں ڈالا۔ کمر کو چھوتے اپنے گھنے سٹریٹ ہنی براؤن بالوں

میں برش کیا۔ لیڈر کے بیج شوز پہنے اور ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکاتی کلیٹ کو تالا لگا کر جلدی

جلدی سیڑھیاں اترنے لگی۔

شام سیندوری ہو رہی تھی، ہوا بخ بستہ، تھکا تھکا یا سورج دن بھر کی مسافت کے بعد دور

پہاڑ کے اس پار پناہ ڈھونڈنے جا رہا تھا اور۔۔۔ شام کیساتھ کائنات کا ذرہ ذرہ سیندوری رنگ

میں رنگا جا رہا تھا۔

دھنک کے شکوک یقین میں بدلنے لگے۔ اگر وہ فرار نہیں ہوا تھا تو اپنے ملازم خاص کو بتا کر جاتا۔

”جب کہیں جاتے ہیں تو آپکو بتا کر جاتے ہیں؟“ وہ خالص رپورٹروں والے انداز میں اپنے یقین کے تصدیق کیلئے پوچھنے لگی۔
”جی ہاں“۔ وہ مختصر ابولا۔

اور۔۔۔ دور سے اسے مرمریں ستونوں والے محرابی برآمدے میں سے گزرتی ایک ادھیڑ عمر عورت دکھائی دی۔

صاف سمرے کپڑے پہنے، بالوں کا جوڑا بنائے ہر پر سفید شفاف دوپٹہ لٹے، یہ خاتون ہی شاید اسے کچھ بتا پاتی۔
دھنک آگے بڑھی۔

اور ملازم خاص ایک نظر اسے دیکھتا، دھیرے سے مسکراتا دوسری طرف چل دیا۔ اسکی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اسے اپنے مالک کے متعلق معلوم تھا کہ وہ کہاں گیا تھا مگر بتا نہیں رہا تھا۔ جیسے اسے نہ بتانے کی تاکید کی گئی تھی۔

”آداب“۔ جانے کیوں دھنک کو یہ خاتون اچھی سی لگیں۔

اسکے سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ اپنا نظر کا چشمہ اتار کر اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے دوبارہ چشمہ پہننے لگیں۔

”آؤ بیٹی اندر آؤ“۔ وہ بہت شفقت سے کہنے لگیں۔

”شکریہ آئی۔ مگر میں اندر نہیں آسکتی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں نے... مسز فخر عالم کا پتہ کرنا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔“

اور فخر عالم کی ہاؤس کیپر۔ ایک بار پھر اسے سر سے پاؤں تک پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائے لگیں۔

”اچھا تو وہ تم ہو جس کیساتھ وہ فون پر کتنی کتنی دیر باتیں کرتا رہتا ہے۔ اچھا ہوا بیٹی تم خود

جیسی کا کرنا یاد رکھو آگے بڑھی۔

سفید رنگ مرمر سے مزین وسیع درمیان کوشی، اسکی محرابیں، اونچے اونچے مرمریں ستون اور گہرے سرخ پھولوں سے لدی بالکونیاں واقعی کسی محل کا نمونہ تھیں۔

میکٹ پر کمرے مسلح چوکیدار نے اسے آسانی سے اندر جانے دیا۔ تاحد نظر پھیلے وسیع عملیں لان، موہمی پھولوں سے آراستہ رنگ برنگی کیاریاں، نایاب گلابوں کے تختے، جا بجا قدما اور سرو سے لپٹی سرخ اور سفید نئے نئے پھولوں کی بلیں۔

قریب کے کلمے میں گی Kiss Me Quick کی کانٹے دار شاخیں اور ہر شاخ کے سرے پر لگے دو دو پتیوں والے چار چار سرخ پھولوں کے جھرمٹ کو تکی محفوظ ہوتی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔

پھر جیسے وہ چونکی۔ وہ ان نظاروں سے لطف اندوز ہونے نہیں مسز فخر عالم کا پتہ کرنے آئی تھی۔

یکدم ہی اسکے قدم تیز ہو گئے۔ متلاشی نظریں اور ادا ہر سنبھلے لگیں۔

”میں آپکی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔“ جیسے کوئی خاص ملازم تھا، پاس آ کر مودب طریق سے ابولا۔

”مسز فخر عالم گھر پر ہیں؟“ وہ جانتے ہوئے بھی پوچھنے لگی۔ شاید نوکروں کا رد عمل دیکھنا چاہتی تھی۔

”جی نہیں۔ وہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔“ اس کا لہجہ کسی بھی جذبے سے عاری تھا۔

”کہاں گئے ہیں؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”کی اور ملازم کو بتا کر گئے ہیں۔“

”شاید نہیں۔ ورنہ مجھے ضرور بتا کر جاتے۔“ وہ یقیناً ملازم خاص تھا۔ جواتنے دھوکے سے کہہ رہا تھا۔

پھیرا۔

”خدا حافظ“۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

قلیٹ پر آ کر اس نے جلدی جلدی بیگ میں دو جوڑے کپڑے، ہائیٹ سوٹ، جیکٹ، چھوٹا سائپ ریکارڈر، پیڈ جین، پیٹنگ کے برش، پینٹس، غرض بر ضروری چیز ڈالی۔ بیگ کندھے سے لٹکایا، اور بازو پر ہلکا سا کیبل لیتے ہوئے اپنی ساتھی فرزانہ کو ضروری کام سے اپنے گھر جانے کا بہانہ بناتے ہوئے تیزی سے قلیٹ سے اتر آئی۔

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ٹرین چھوٹنے میں صرف چالیس منٹ تھے۔ وہ پریشانی سے ادھر ادھر ٹیکسی کی تلاش میں دیکھ رہی تھی۔ ایک خالی رکشہ پاس سے گزر رہا تھا وہ اسی میں بیٹھ گئی۔

”ریلوے سٹیشن“۔ اپنا شولڈر بیگ اور کیبل سیٹ پر رکھتے ہوئے وہ جلدی سے بولی۔ وہ ایک سیکنڈ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اور۔۔۔ ٹکٹ خرید کر وہ ٹرین میں چڑھی، اپنا سامان اوپر رکھا اور اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے اتار کر اپنے قریب رکھتے ہوئے سیٹ پر بیٹھی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ آج کی پوری رات، کل کا سارا دن اور پھر کل شام کے چھ بجے اس نے وہاں پہنچنا تھا۔

سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر اس نے ہنسی ہنسی آنکھیں موند لیں۔ بہت سی سوچوں اور اندیشوں کے ہا وجود اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ جہاں مسٹر فخر عالم کی اسٹیٹ تھی وہیں قریب ہی ایک پہاڑی گاؤں میں اس کی امی کی کلاس فیلو اور دوست ایک پرائمری سکول کی ہیڈ مسٹر لیس تھیں اور دھنک نے سردست وہیں قیام کرنا تھا۔

اس نے اپنے لئے چائے منگوائی۔ اور گھونٹ گھونٹ کر کے پتی چلتی ٹرین میں سے باہر تارکیوں میں گھورتی رہی۔

رات کا کھانا اس نے نہیں کھایا۔ دل نہیں کر رہا تھا۔ ایک گلاس دووہ منگوا کر پیا اور اپنا

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔ ”خدا حافظ“۔ وہ دیکھ کر ہنس نکلتا۔ مسٹر فخر عالم سے وہ بھی

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پتھر پتھر سے ڈھیر ڈھیر لگا دیا اور وہ دوسری دن صبح کو کھانسی سے لڑھکھکی ہو کر اٹھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

میل اور لیجے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

ٹرین سے اس نے گلی سے سامان ٹیکسی میں رکھوایا اور ڈرائیور کو اپنی امی کی دوست آنٹی نور جہان کے گاؤں کا پتہ بتا دیا۔

آنٹی کا گاؤں یہاں سے تقریباً بارہ میل پر تھا۔ ٹرین بھی لیٹ پہنچی تھی۔ ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہوتے پونے سات اور ہے تھے۔

موسم بدل چکا تھا۔ بلکہ یہاں تو خاصی سردی تھی۔ دن قدرے چھوٹے اور شامیں تو وہاں بھی مخمبستہ ہو چلی تھیں مگر۔

یہاں تو جیسے دنیا ہی اور تھی۔ چکر دار سڑک کے ایک طرف پانی اور دوسری طرف پیمانہ پر اونچے قد اور درختوں کا ساحل نظر پھیلا جھل نظر آ رہا تھا۔ بلکہ سے سفید بادل درختوں میں تیر رہے تھے اور۔ کھراتی زیادہ تھی کہ چلنا دشوار ہو رہا تھا۔

شام کی سیاہیاں اترنے لگی تھیں۔ سردی بڑھ گئی تھی اور ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ چوٹی پر پہنچ کر کہیں آنٹی کا چھوٹا سا سکول اور گھر دکھائی دیئے۔ ٹیکسی کا کرایہ ہوا کرتے ہوئے اس نے سامان اتروایا اور آگے بڑھے ہوئے نگڑی کے چھوٹے سے برآمدے میں دروازے پر دستک دی۔

وہ پہلے بھی اپنے والدین کیساتھ گرمیاں گزارنے میں آئی تھی، بلکہ کئی بار۔ علی نشین تھا یہ چھوٹا سا۔ قلیٹ کرائے پر لیکر وہ لوگ بیزن گزارنے آکر یہیں آتے۔ پورا آنٹی ہی گھر میں بیٹھ رہی تھیں۔ یہ انکا آبائی گاؤں اور آبائی گھر تھا جسے انہوں نے کچھ حصہ اپنے لئے رکھ کر باقی میں سکول لیا تھا۔ شاہی کی ٹیکسی میں سکول کھول چکا کری اپنے آپ کو کچھ مصروف رکھا ہوا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ

READING Station



اتنا بھاریا تھا اٹا پھونسا یہ مگر اور اسے خوبصورت تھے اسکے اطراف کہ جی چاہتا تھی
۔ یہیں بس جاؤ تھیں رہ جاؤ!

آئی اسے بغیر اطلاع کے یوں اچانک دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔

رات کے کھانے کے بعد جو دونوں ایک ہی کمرے میں گرم گرم رضائیوں میں گھس کر
باتوں میں الجھیں تو ایک بج گیا رات کا۔ دنیا جہان کی باتیں ہوئیں مگر۔

دھمک نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ یہاں کس مقصد سے آئی تھی۔ بس کہا۔ تھک گئی تھی
بہت۔ چند منٹوں میں لے لیں۔ بجائے مگر جانے کے ادھر آ نکلی۔ کہ اسے آئی یاد آ رہی تھی
اور پھر۔ ایسے موسم اور ایسے ماحول سے اسے عشق تھا۔ لگے ہاتھوں وہ دو ایک ہی نظر لگتی تھی
جاتی!

صبح آذان کے وقت اسکی آنکھ کھلی۔ ٹھنڈے تازے پانی سے اس نے منہ ہاتھ دھوئے۔ اور
نماز کی تیاری کرنے لگی۔

فارغ ہو کر اس نے سفید زمین پر سرخ چپک کی شلوار لٹیریں پہنی۔ لاسیٹ براؤن خوبصورت
بالوں میں برش کیا اور سفید جوگرز پہن کر سفید مائیک سی جیکٹ پہنتے ہوئے کالراؤ پر اٹھایا اور باہر
برآمدے میں آ نکلی۔

آئی کے مکان پر سورج کی پہلی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ مگر سامنے دور تک بادلوں کا راج
تھا۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ گہری کھائی، پھر چڑھائی، چیز اور صنوبر کے فلک بوس درخت،
جیسے کچھ تھا ہی نہیں یہاں۔ ہاں دور اس پار۔ ادھر ادھر واقع گھروں کی ٹین کی چھتیں ایک
بار پھر دھوپ میں سنہری ہو رہی تھیں۔

قدرت کس قدر جدت پسند واقع ہوئی تھی!
وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

چند قدم چلتی وہ مشرقی رخ پر برآمدے کے آخری سرے پر آ گئی۔ یہاں تاہم وارڈ حلالان
تھی اور نیچے کافی گہرائی پر بہتا مخصوص شور کر رہا تھا۔ دریا میں چاندی کی طرح چمکتا شفاف
پانی بہ رہا تھا۔ اور جگہ جگہ درختوں کے کٹے ہوئے تنے پانی کے بہاؤ پر چلے جا رہے تھے۔
برآمدے کے کھڑکی کے کھبے سے سر نیکی اسکی نظرس دریا کے اس پار اونچائی پر چڑھتا صنوبر
اور کٹے قد اور درختوں پر گئیں۔

یہ۔۔۔ فخر عالم کے جنگلات تھے۔ اور۔۔۔ اس سے بھی آگے کئی کوسوں پر محیط اسکی
اسٹیٹ تھی۔ مدت باتوں کے دوران آئی نے اسے اپنے مشرقی پڑوسی کے بارے میں بتایا تھا!

اس نے سر جھٹکا۔ سوچوں سے باہر نکلی۔

کہ اس نے کم سے کم وقت میں بہت سارا کام کرنا تھا!

’پچھلے کئی مہینوں سے ہم لوگوں نے کتنی کوشش کی اس کا انٹرویو لینے کی۔ مگر صاف جواب مل جاتا تھا کہ وہ کسی کو انٹرویو نہیں دیگا۔ اسکے کانوں میں انکل اشفاق کے الفاظ گونجنے۔ میں کرونگی اس کا انٹرویو۔ اس نے جواب میں کہا تھا لیکن۔

اب اس نے آئیڈیا بدل لیا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی۔ کہ انٹرویو کیلئے اسے بھی ٹکا سا جواب مل جاتا تھا۔ سو ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ کہ بغیر انٹرویو کے ہی اس کے تمام حالات اسے پتہ چل جاتے۔ کیسے؟

یہ بڑا نیڑھا سوال تھا۔ اور۔

وقت کم مقابلہ سخت تھا!

”صبحی صبح وہ کبھی کبھی گھوڑے پر سوار پانی کے اس پار اپنے جنگل میں گھومتا نظر آتا ہے۔۔۔“ اسے اچانک آنٹی کی بات یاد آئی۔

اور۔۔۔ بر خیال ذہن سے نکال۔ وہ اندر آگئی۔

آنٹی چھوٹے سے کچن میں تخت پر بیٹھیں نماز کے بعد اب بھی دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے دعا مانگ رہی تھیں۔

دھنک اندر کمرے میں گئی۔ جلدی جلدی اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں ایک جوتا کپڑے، چند برش، پینٹس، پیڈ پین اور باقی ضروری اشیاء ڈالیں اور کچن میں آگئی۔

”آنٹی میں چلتی ہوں ذرا۔ دریا اور پار والا جنگل دھوپ کی پہلی کرنوں میں بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔ سو جتنی ہوں تصویر بنانا شروع ہی کر دوں۔“ جو گرز پر جھکتے ہوئے ایک باز پھر بندھے ہوئے تسموں کو کسنے لگی کہ سر اسر جھوٹ بولتے وقت زبان کچھ ساتھ نہ دے پارتی تھی۔

”اے جی ماٹھے تو کرتی جاؤ۔“ دو ماٹھے کر کے انہوں نے تخت پر بچھے جا نماز کا کون موڑا

”آنٹی پھر ماحول کی وہ خوبصورتی نہیں رہے گی۔“

”لو بھلا۔ اچھا یہ گرم گرم چائے کا ایک کپ تو چیتی جاؤ۔“

اور آنٹی کے سر پر اس نے چوٹھے پر رکھی کیتلی سے گرم گرم چائے پیالی میں اٹھیل لی۔

”اچھا آنٹی جاتی ہوں اب۔“ جلدی جلدی چائے حلق سے اٹارتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی

ہوئی۔ ”اگر دیر ہوگئی تو فکر مت کیجئے گا۔ میں گرد و نواح میں ٹھہری ہوگی کہیں۔ آ کچھ پتہ ہے

تصویر بنانے میں تو کئی کئی دن بھی لگ جاتے ہیں۔“ اس نے دلوں کا خاص طور سے ذکر کیا۔

کیا پتہ اسے کتنا وقت لگ جاتا۔ آنٹی پریشان ہوئیں پھر۔

اور بیچاری آنٹی نے سوچا صحافت تو ویسے بھی لڑکی کو لڑکا بنا دیتی ہے۔ اور پھر اس نام

ہوائے کو تو تصویریں بنانے کا بھی شوق تھا۔ کہیں رہ بھی لیتی تو اپنی حفاظت آپ کرنا جانتی تھی۔

”جیسے تمہاری مرضی بنی۔ مگر کام جلدی ختم کرنے کی کوشش کرنا میں انتظار کرونگی۔ ابھی

تو ہم نے ٹھیک سے باتیں بھی نہیں کیں۔“

”اچھا آنٹی۔“ اس نے کہا۔

اور باہر نکل آئی۔ ارد گرد نگاہ دوڑائی۔

دور پر لی طرف دریا کی چوڑائی کافی کم اور بڑے بڑے پتھر زیادہ تھے۔ وہ وہیں سے

دریا عبور کرے گی۔ پر۔

”سنا ہے وہ اپنے علاقے میں کسی اجنبی کو گھسنے نہیں دیتا۔“ آنٹی نے رات یہ بھی تو کہا

تھا۔ پھر؟

اور۔۔۔ اسکے ذہن میں جیسے کوئی اسالپا کا۔ ترکیب آئی گئی دماغ میں۔ لیکن۔

اگر قسمت یاد رہتی تو وہ نکلا ہوگا گھڑ سواری پر!

تیز تیز قدم اٹھاتی وہ ناہموار سر سبز ڈھانوں پر چلی جا رہی تھی۔ سفید جو گرز سفید بیگٹ

اور لائیٹ براؤن سٹریٹ بالوں میں سفید ہی بیئر بینڈ اسے بہت مصوم بنائے دے رہے تھے۔

اسکا چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے مبرا تھا کہ خدا نے اتنا حسن دے رکھا تھا کہ ضرورت ہی

نہ پڑتی تھی۔

دور یا کے تنگ حصے پر پہنچ کر وہ ایک پل کور کی۔ اوپر نگاہ کی۔ گھنے جنگل میں بادلوں نے کھلی چارگی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اسکے ذہن و دل میں اس وقت مچی تھی۔

وہ بار بار کرہاں کرنے جا رہی تھی۔ جہاں جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ پھر اس جگہ کا مالک ایک قاتل اور سفاک شخص تھا۔ اور وہ بہر حال ایک لڑکی۔

بولڈ ہونے کے باوجود اس وقت دل ایک بار دھڑکا ضرور!

بڑے سے پتھر پر قدم رکھتے وقت اس نے دل ہی دل میں اپنی کامیابی کی دعا مانگی اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھی۔

ذولتی ڈنگاتی پتھروں پر قدم بھاتی آخر کار وہ دوسری سمت پہنچ ہی گئی۔ اب دوبارہ اونچی ڈھلان تھی۔ وہ بھی اس نے بخوبی طے کر لی۔

جنگل میں بادلوں اور کبر نے بھول بھلیوں کا سا سماں پیدا کیا ہوا تھا۔ کوئی سرا کوئی سمت تو نظر آتا نہیں تھا۔ وہ اندازے سے آگے بڑھنے لگی۔

کچھ دور جا کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ پاس ہی کہیں سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی تھی۔ اس کا دل ایک بار پھر دھڑکا۔ کہیں وہ ہی تو نہیں تھا۔ ایک درخت کے چوڑے سے سے تنے کے پیچھے سے وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔

وہ ہی تھا۔ سو فیصد وہی تھا۔ وہ اسے ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ عام سی جینز پر جیکٹ پہنے چہ قدم نیچے دیا کے رخ پر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ جیسے رائیڈنگ کا یہ آخری مرحلہ تھا۔

اوپر۔ اپنے پلان کے مطابق۔ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر۔ دھتک وہیں لپٹے ہوئے اگلی جانب جا رہی تھی۔ نہ جام کیا ہوگا؟ یہ سوچتے کو اس نے وقت ہی کب لیا تھا۔ فخر عالم تک ڈھلان پر ٹرختے ہوئے تو اسے غامض چوٹ نہیں آئی تھی مگر اسکے گھوڑے کے ٹاپوں کے پیچھے کے بھاسے کٹھن ہوش نہیں رہا تھا۔

تھوڑی سی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں سوکھا۔ وہ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دیئے دیں پاس کھڑا سے گھور رہا تھا۔

دھتک نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اسکا جواز جواز دکھ رہا تھا۔ نفاہت اتنی تھی کہ اٹھ ہی نہ سکی۔

”آپکو بہت چوٹیں آئی ہیں۔ آپکے پاس آکر گرنے پر گھوڑے نے بدحواس ہو کر آپکو زخمی کر دیا ہے۔ آئیے آپکو ڈاکٹری مدد چاہیے۔“ اسکا چہرہ پاٹ اور آواز کسی بھی قسم کے جذبے سے عاری تھی۔

وہ جھکا اور دھتک کے کسی قسم کے احتجاج سے پہلے ہی اس نے اسے بڑی آسانی سے اپنے دونوں بازوؤں پر اٹھایا اور قریب کھڑے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

جنگل میں ہی درختوں اور سبزے میں گھرا اسکا لکڑی کا ڈھلانی چھتوں والا گھر بے حد خوبصورت تھا۔

گھر کے نیچے سے ہوتے ہوئے پانی اس طرف ایک آبشار کی شکل میں گر رہا تھا۔ شاید مصنوعی جمیل نکال کر، یہاں تک لا کر اسے آبشار کی شکل دی گئی تھی۔ گھر کے نیچے ہی جمیل

میں دور اس کنارے پر ایک کشتی بندھی نظر آ رہی تھی۔ جمیل کے اوپر اور گھر کے سامنے لکڑی کا ایک چنگلے دار چھوٹا پل بھی گھر کے دائیں اور بائیں اطراف کو ملانے کیلئے بنایا گیا تھا۔ مختصر سے

پل پر چھوٹا سا لپ پوسٹ بھی نصب تھا۔ پل کے دائیں اور بائیں طرح طرح کے خوبصورت پھولدار درخت اور خود در سفید ڈیزیز بکھرے پڑے تھے۔ بائیں جانب پتھروں کی میڑھیاں

پودوں اور پھولوں میں چھتی چھپاتی تھیں۔ پل کے پیچھے سے لکڑی کا جھونپڑا نما بڑا سا دروازہ مکان دکھائی دیتا تھا۔ چوڑے شیشوں کی چوڑی چوڑی کھڑکیوں

میں کریم کالر کے پردے ایک طرف بنائے گئے تھے۔ تمام مکان میں لکڑی کی پونٹنگ ہوئی ہوئی تھی۔ اوپر کی منزل کی ہالکنوں میں سے ان گنت سرخ پھول بھول رہے تھے۔ اور ایسے ہی

سرخ پھولوں کی بنیل مکان کی چھت کو یوں گہرے میں لئے تھی جیسے پھولوں کی چادر ڈال دی

وہ دونوں سہارا دیکر اسے بیڈروم میں لے آئے۔ آرام وہ بستر پر لٹایا۔ اسکے جو گرز اتارے اور کندھوں تک نرم و گرم کپل اوڑھادیئے۔

تھوڑی ہی دیر میں سائیس کیساتھ والا آدمی اس کیلئے اوڈٹسین ملا کر مگر مدد دے لے آیا۔ شاید فخر عالم نے کہا ہوگا۔ دھنک نے سوچا۔

مگر نہیں۔ اس نے فوراً اپنی سوچ کی تردید کی۔ وہ کڑسی، ہمدردی اور مہربانی جیسے جذبوں سے عاری لگتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر بھی آ گیا۔ آتے ہی اس نے اسے ٹینس کا انجکشن لگایا۔ تبھی فخر عالم اندر آ گیا۔ کچھ دیر قبل وہ Casual ڈریس پہن کر لیا تھا۔ ڈارک بلو تیشی سوٹ میں بلیوس تھا اس وقت۔

”گڈ مورنگ سر۔“ نوجوان ڈاکٹر متوذب طریق سے بولا۔

”مورنگ۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ اور۔

ایک سرسری نگاہ دھنک پر ڈالتے ہوئے پرلے سر سے پر جا کر کھلی کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔

”چونین بہت آئی ہیں مگر۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں۔“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے فخر عالم کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”see ا۔“ ڈاکٹر کی مسکراہٹ کے بدلے میں اس نے سنجیدگی سے کہا اور۔

رخ اندر کی طرف کر کے ڈاکٹر کو مختلف زخموں کی صفائی کرتے دیکھنے لگا۔

اسکی دودھ جیسی سفید کلائیوں اور چہرے کی سیب جیسی رنگت کو جو اس وقت کھلا کر کچھ اور بھی پرکشش لگ رہی تھی، نظر انداز کرتی اسکی نظریں بڑی ہوشیاری سے ٹیوں کیساتھ ساتھ گردش کر رہی تھیں۔

”کہنی کے پاس Stitches آئیگے سر۔“ ڈاکٹر فخر عالم کو بیت اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

گئی ہو۔ ٹھلی منزل کو سوائے ایک آدھ کھڑکی کے تمام پھول پودوں نے چھپا رکھا تھا۔ گھر کی تھل۔ جنت کا کوئی ٹکڑا جیسے زمین پر آ رہا تھا۔ اور۔

اسکا کہیں۔ اب بھی اسے اپنے آگے بٹھائے، بازو سے سہارا دیئے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اسکے اتنے قریب تھی کہ اسکی لگائی ہوئی مدھر پرفیوم کی مہک بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

پچھلے چند دنوں کو وہ جیسے اسکا قافل ہونا بھول گئی تھی۔ اچانک ہی اسکی تمام تر نفرت لوٹ آئی۔ کسمسا کردہ اس سے الگ ہونے لگی۔

”آپ ٹھیک سے بیٹھیے پھر گر جائیگی۔“ وہ راستے پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ ”میرے علاقے میں کسی کو میری اجازت کے بغیر گھسنے کی اجازت نہیں۔ آپ شاید یہاں اجنبی ہیں۔ اگر آپکی جگہ کوئی لڑکا ہوتا تو اس وقت حالات شاید کچھ اور ہوتے۔۔۔“

ہونہ۔ حالات اور کیا ہوتے؟ مار ڈالتا اسے قتل کر دیتا۔ بھاری رقم دیکر ایک بار پھر جان چھڑو لیتا۔

دھنک کی نفرت سوا ہو گئی۔ اسکا ساتھ اسکی برداشت سے باہر ہونے لگا۔

مگر۔ یہ کیا کم تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ کہنی گھسی سانس لیتے ہوئے اس نے اپنے سر اچھے پر نگاہ کی۔

اسکے کپڑوں پر وہ اتنی جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ ہائیس کہنی پر تو خاصا بڑا زخم آیا تھا۔

گھر پہنچے ہی اسکا سائیس بھاگتا ہوا اسکی مدد کو آیا۔ اسے دیکھ کر دور سے گزرتا ایک اور ملازم بھی دوڑا آیا۔

”انہیں گیسٹ ہاؤس لے جاؤ۔“ گھوڑے سے اترتے ہی اس نے دونوں کو حکم دیا۔ ”چونین آئی ہیں۔ اکرم سے کہو ڈاکٹر کو بلوانے۔“

پور۔ بڑے بڑے ڈگ بھرتا وہ گھر کی طرف بڑھا۔

گھر کے عقب میں گیسٹ ہاؤس تھا۔ بالکل گھر سے ملتا جلتا۔

”Yes, go ahead.” اس نے کہا۔

اور مزید کچھ کہے بنا بڑے بڑے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نے Stitches لگائے تمام زخم ضرورت کے مطابق صاف کئے، دوائیاں، پٹیاں کیں، دوائیوں کا نسخہ لکھا، استعمال سمجھایا۔

”آجکان ذرا ریٹ لیں۔ خوب کھائیں پیئیں۔ ٹھیک ہو جائیگی۔ کل میں پھر آؤں گی دیکھنے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی اور چل دیا۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اسکی دوائیاں آچکی تھیں۔ اسے بہترین ناشتہ کرایا گیا تھا۔ اور اس وقت وہ پھر لٹھی سامنے کی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اونچے اونچے پائیز کا دیوڑا اکاڑنگ تھا۔ اپنے مالک جیسا!

جانے کیوں ایک لمحہ کو اس نے سوچا اور پھر فوراً ہی جیسے اپنی سوچ بھی حقیر لگی۔ اس نے رخ ہی دوسری طرف موڑ لیا۔

یہاں تک تو وہ پہنچ گئی تھی۔ اتنی آسانی سے اسکی یہ سکیم کارگر ہوگی اسکے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اسے اپنے زخم اپنی سکیم کے کامیاب ہونے کے مقابلے میں ہیچ لگے۔ وہ اس سے بھی زیادہ سہم سکتی تھی یہاں تک پہنچنے کیلئے۔

آجکان وہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق ریٹ لے گی اور پھر۔۔۔ کل سے اپنے منصوبے کے باقی حصے پر عمل پیرا ہوگی۔

اس نے تسلی تسلی آنکھیں موند لیں اور۔۔۔

آرام کی دوا کی وجہ سے اسے جلد ہی غنودگی نے آیا۔

اسے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ یوں ہی خالی خالی نظروں سے کھڑکی میں سے باہر گھورتی رہی۔ تبھی دھیرے دھیرے بادل کمرے میں سے باہر نکلے۔ بادلوں میں لپٹے قرمی پائیز بھی نظر آنے لگے۔ مگر۔۔۔

یکدم ہی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی۔

وہ پہلے بھی ایسے علاقوں میں گرمیوں کے موسم میں آچکی تھی۔ پہلے بھی یہ سب دیکھ چکی تھی۔ مگر ہر بار گھاٹیوں میں پہاڑوں پر درختوں میں سے لپٹے پٹائے یہ بادل اسے نئے لگے۔ ہل میں دھوپ ہل میں بادل اسے نرالے لگے۔ کبھی بوند ہانڈی اور کبھی موسلا دھار بارش اسے انوکھے لگے۔

تبھی اسکے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اسکی محویت ٹوٹی۔ ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔

”یس دھنک سپیکنگ“ اس نے ماؤتھ میں کہا۔

”میڈم! میں گن سے اسلم بول رہا ہوں۔ آپکا لنگ ایک بجے گیا تھا مگر آپ آرام کر رہی تھیں۔ اس وقت بھوادوں؟“

”نوتھنگ یو۔ کھانا نہیں، چائے بھوادیں پلیز!“

”جو حکم“۔ اور فون بند ہو گیا۔

اسکے اس جنگل میں داخل ہونے کے بعد سے اب تک اس کیساتھ صرف ملازموں نے

یا پھر اس ڈاکٹر نے بات کی تھی۔ فخر عالم نے پوچھا تک نہیں تھا کہ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ کیا کرنے آئی تھی؟ یا پھر اسکی طبیعت کیسی تھی؟ کھانا پینا مل رہا تھا یا نہیں؟

ہاں سوائے شروع کے ایک دو جملوں کے۔

وہ بھی یہ جتانے کہ وہ اسکے علاقے میں بغیر اجازت آئی تھی اور یہ بھی کہ چونکہ وہ ایک

لڑکی تھی اسلئے وہ اسے اٹھا کر لانے اور ڈاکٹر کو دکھانے کا احسان کر رہا تھا ورنہ اگر لڑکا ہوتی تو

شام پانچ بجے اسکی آنکھ کھلی۔ کھلی کھڑکی میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن۔۔۔ اسے تو کز بھر پر پائین کے درخت تک نظر نہ آرہے تھے۔ بادلوں کا ہجوم کھڑکی کے راستے اندر گھسنے لگا تھا۔ اسے اس مشکل سے آنے لگی ماس کے باوجود بادلوں کی مخصوص مہک

شاید وہیں سے باہر پھینگو اور جاتا۔ یا پھر جانے کیا سلوک کرتا اس کیساتھ؟

وہ آہستہ سے بستری سے اٹھی۔ اسکا بیگ الماری میں رکھا تھا۔ اس میں سے پینڈ اور پینڈا نکالے۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھی اور — ابتدا کی!

جناب ایڈیٹر صاحب!

یہ آدی بد خو ہے بلکہ بد تمیزی کی حد تک بات کرتا ہے۔ لمبے قد کا بہت ہی ہینڈ سٹم شخص ہے مگر بہت ریزروڈ اور جیسے کئی راز دل میں چھپائے ہے۔ بہت کم اور بہت سوچ کر بولتا ہے جیسے انکی کسی بات سے کوئی راز کھلنے کا اندیشہ ہو۔ کسی کو چوٹ آئے، زخم آئیں انکی بلا سے۔ آنکھوں تک سے ہمدردی نہیں جھلکتی۔

میرا یہاں پہلا دن ہے۔ خدا کرے جلد ہی کوئی Clue مل جائے، بلکہ جیسے جیسے Hints ملنے جائیں گے میں خطر روانہ کر دیا کرونگی۔ یا فون پر بتا دیا کرونگی... ”

وہ دوبارہ اٹھی۔ مین واپس بیگ میں رکھا اور پینڈ نہایت احتیاط سے الماری میں بچے اخبار کی تہہ میں چھپا کر رکھ دیا۔

پھر وہ ہاتھ روم گئی۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ واپس آ کر سکارٹ ریڈ کپڑے نکالے۔ ڈریسنگ روم میں جا کر خون کے داغ دھبوں والے کپڑے بدل کر صاف پہن لئے۔ آہستہ آہستہ بالوں میں برش کیا۔ کپڑوں پر اپنا پسندیدہ کلون پیرے کیا۔ تو جیسے طبیعت بہت ہلکی محسوس ہوئی۔

رات کھانے کے بعد اس نے ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق دوائیاں لیں اور — سو گئی۔ رات کے دو بجے کے قریب کچھ آہٹوں، بد بے سے شور سے اسکی آنکھ کھل گئی۔

چہلے تو وہ اسے یوں ہی اپناوا ہمہ بھگتی رہی۔ مگر — اب بھی وہی قدموں کی آہٹیں تھیں، دہلی دہلی ہاتھیں تھیں۔ کبھی پاس ہی، کبھی قریب ہی۔

انھہ کر وہ کمزری کے پاس آئی۔ سوائے پائینز کے سائیں سائیں کے اس طرف تو کچھ نہیں تھا۔

ہا — کچھ قاضیوں۔ یہی وقت تھا، یہی موقع تھا۔ اسے کھونا نہیں چاہیے تھا۔

گو باہر بہت ٹھنڈی تھی، کپ اندھیرا تھا، سائیں سائیں کرتے دیو قامت درخت تھے، بھوتوں کا جیسے بسیرا تھا پورے جنگل میں — اس پر قدموں کی آہٹیں، دہلی دہلی سرکشیاں — سب کتنا پر اسرار تھا!

بغیر وقت ضائع کئے اس نے صوفے کے بازو سے اپنی جیکٹ اٹھائی اور پہنتے ہوئے کوئی آہٹ کئے بنا آہستہ سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ چاروں طرف دیکھا۔ کچھ نہیں تھا۔ وہ اور آگے بڑھی۔ فخر عالم کے گھر تک گئی۔ اب آہٹیں واضح ہو رہی تھیں، ہاتھیں گوصاف سنائی نہ دیتی تھیں مگر پہلے کی نسبت نمایاں ہو رہی تھیں۔

وہ دیوار سے چپکتی چپکاتی اسی سمت بڑھی۔

کوٹھی کے بائیں طرف جہاں گاڑیاں پارک ہوتی تھیں وہیں ہو رہا تھا کچھ۔

دیوار کے کونے سے جو جھانک کر دیکھا تو اوپر کی سائیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

فخر عالم نے لمبا دوڑ کوٹ پہن رکھا تھا۔ کالر اوپر اٹھایا تھا جو چہرے کو چھپائے تھا۔ ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں دوسرے میں ٹورچ تھا۔ جسے وہ کبھی کبھی روشن کر لیتا۔ اور —

اسی لمحے بھر کی روشنی میں دھنک نے دیکھا وہ شخص سفید چادر میں لپٹی ایک لاش کو ٹرک میں رکھ رہے تھے۔ لاش کو رکھ کر ایک آدمی وہیں لاش کے پاس بیٹھا رہا اور دوسرا نیچے اتر آیا۔ فخر عالم نے جیب سے کچھ رقم نکالی، اس آدمی کو دی، کچھ ہدایات دیں اور وہ شخص بھی ٹرک میں جا بیٹھا۔ دونوں آدمی سب سے لگ رہے تھے۔ پھر ٹرک سٹارٹ ہوا، روانہ ہوا۔ اور فخر عالم آہستہ آہستہ چٹا گھر کی طرف والا موڑ مڑ گیا۔

تو ایک — اور قتل کیا تھا آج اس نے!

دھنک کے کانوں تو لبو نہیں تھا بدن میں۔ وہ ایک جرنلسٹ تھی، بولڈ بھی تھی۔ مگر — ایسے مناظر تو بڑے بڑوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ اسکے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ جیسے تپے کر کے وہ اپنے کمرے تک پہنچ گئی۔

بقی تک نہیں جلائی۔ چپکے سے بستری میں گھس گئی۔

باقی کی رات میں نے آنکھوں میں کافی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ کبھی آنکھوں میں بغیر کپڑے میں لپی لاش بھی دو سب سے آدی کبھی پر اسرار فخر عالم کا اس آدی کو رقم دینا، کچھ ہدایت دینا۔ لاش کو پانی میں بہا دینے کی یا پھر کہیں گھڑا کھود کر دبا دینے کی۔ اسے پاس ہی دریا، سارا جنگل مظلوموں کے مدفن لگے۔ سائیں سائیں کرتے بلند و بالا درخت فریاد کرتے سسکیاں بھرتے محسوس ہوئے اور۔۔۔ باہر کی سیاہ تاریکیاں ماتم کناں لگنے لگیں۔
تمام رات وہ بستر میں دیکھی پڑی رہی۔

سورج کی پہلی کرن کیساتھ اسکی جان میں قدرے جان آئی۔ رات والا واقعہ گویا اب بھی ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔

وہ آہستہ سے بستر سے اٹھی۔ اسکے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا تھا۔ ہاتھ روم جا کر اس نے منہ ہاتھ دھوئے۔

ڈریسنگ روم میں آ کر خوبصورت بالوں پر برش کیا۔ حسین چہرے ہر خنی مائل شریقی آنکھوں اور پیار سے پرچھڑ کپڑوں میں وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ وہ بہت کم کپڑے ساتھ لائی تھی۔ اسے زیادہ کپڑوں کی نہیں فخر عالم پر زیادہ نگرانی کی ضرورت تھی۔ فخر عالم۔۔۔ اسے جہر جہری سی آگنی۔ اتنی ڈشنگ پر سنٹلی والا شخص کیونکر ایسے کاموں میں پڑ گیا تھا؟ یا پھر دولت اور املاک چیز ہی ایسے ہیں کہ انسان کو قتل تک پر مجبور کر دیتے ہیں۔
”ٹرن... ٹرن...“ فون کی گھنٹی پر وہ اچھل سی گئی۔

کمرے میں آ کر ریسیور اٹھایا۔ کان سے لگایا۔
”اسلم بول رہا ہوں میڈم۔ میرے نے بتایا تھا۔ آپ جاگ رہی ہیں اسلئے بیڈنی بھجوا دی ہے۔ آپ پلیز بتائیں کہ بریک فاسٹ میں کیا پسند کریں گی؟“ وہ بہت مہذب طریق سے بول رہا تھا۔

فخر عالم کے ملازم تک اچھے اور ایجوکیٹڈ لگ رہے تھے۔ اتنا اچھا خوبصورت ماحول تھا مگر۔

رات کے اندھیروں میں جرم ہوتے تھے یہاں؟
اسلم کو ناشتے کا بتا کر وہ چند ٹاپے کھڑکی کے کچلے پٹ سے ٹپک لگائے باہر دیکھتی رہی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

”میڈم اب کیسی طبیعت ہے آپ کی“۔ وہ بڑے خلوص سے بولا۔

”بہتر ہوں شکریہ“۔ وہ ممنونیت سے بولی۔

یہاں سب لوگ اچھے تھے۔ سوائے فخر عالم کے۔

”میڈم کسی چیز کی ضرورت ہو تو فون پر کہہ دیجئے گا۔ آج کچن میں مصروفیت کچھ زیادہ ہے۔ صاحب کے ایک خاص دوست آنے والے ہیں...“ وہ نرے صوفے کے قریب میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

”اوہ اچھا۔ اور تو کچھ نہیں چاہیے بس آجکا اور پچھلے دو دنوں کے اخبار چاہئیں اگر لاسکو تو“۔ اخبار پڑھے بغیر اسے چین ہی نہیں آتا تھا۔ اور پھر آج تو تیسرا دن تھا اس نے اخبار کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

”کیوں نہیں۔ ابھی اتنا ہوں میڈم۔“ وہ مودب طریق سے بولا۔

اور باہر نکل گیا۔

بستر میں لیٹی وہ۔ یکے بعد دیگرے تینوں اخبار دیکھ رہی تھی۔

تبھی وہ دروازے پر دستک سے چونکی۔

ڈاکٹر تھا، ساتھ میں ایک ملازم۔

”سنائیے کیسی ہیں آپ“۔ وہ ایک بے تکلف دوست کی طرح بولا۔ پاس آ کر اسکی نبض

تھام لی۔ کل بخار تو نہیں ہوا؟“

یہ ڈاکٹر ہی اچھا تھا۔ اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور تو نہیں تھا۔

”ہوا تھا بلکاسا“۔

”پھر؟“ اسکی نظریں اپنی کلانی پر گھڑی پر تھیں۔

”گولیاں کھالی تھیں اتر گیا تھا“۔

”اس وقت تو نہیں ہے۔“ اب وہ زخموں کی طرف متوجہ ہوا۔

اسکی کہنی الٹ پلٹ کی۔

اس وقت پھر اونچی چوٹیوں پر دھوپ اور نیچی کھائیوں میں بادل منڈلا رہے تھے۔ فخر عالم کو

گھر دھوپ کی نرم و گداز کرنوں میں سنہری ہو رہا تھا۔ اور دور۔۔۔ نیچے کھائی میں اندھیرا

اور بادل دونوں گنڈم ہو رہے تھے۔ پھر۔۔۔ اس پار کھائی سے آگے اوپر کو اونچی ڈھلان پر ایک

دکا اور ہر اکھرے چھوٹے چھوٹے گھروں کی ٹین کی چھتوں کو ایک بار پھر سورج کی شعاعیں

منور کر رہی تھیں۔ کہیں دھوپ، کہیں بادل۔۔۔ روح تک سرشار ہو رہی تھی۔ اور۔۔۔

کچھ فاصلے پر اس نے دیکھا۔ اپنے جنگل میں فخر عالم ٹریک سوٹ پہنے ایک بھاری

بھرم کتے کی زنجیر تھامے صبح کی واگ میں مصروف تھا۔

فخر عالم۔۔۔ جانے کیوں ایک بار پھر وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔

اور پھر اسے خیال آیا۔ رات والا واقعہ لکھنڈ کر کے کچھ تو مواد اکٹھا کر لے۔

انمارٹی سے پینڈ اور پین نکال کر وہ صوفے کے بازو پر بیٹھ کر لکھنے لگی۔

”..... رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مسٹر فخر عالم نے کسی کو قتل کیا تھا۔ لاش ٹرک میں

ڈالتے وقت میں نے خود دیکھ لیا۔ گو اس نے بتیاں نہیں جلاتی تھیں مگر اسکے نورج کی روشنی

میں میں بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ دو آدمی جو لاش کو لٹھکانے لگانے پر مامور تھے وہ بھی چپ اور بے

ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو فخر عالم نے جیب سے کچھ رقم نکال کر دی ساتھ ہی دیرے

دیرے کچھ ہدایات بھی۔ جو میں نہ سن پائی۔

میرا مجھے خود بھی جلدی ہے۔ اسکے کیریکٹر کے Hints تو مل رہے ہیں۔ مگر بس ایک

چیز کا مجھے انتظار ہے کہ کسی طرح پتہ چل سکے کہ اپنی بہن کو اسی نے مارا ہے۔ میں آج آپکو فون

کرنے کی بھی کوشش کرونگی۔

اتنا لکھ کر اس نے پھر اسے الماری میں اخبار کی تہ میں چھپا لیا۔

معاذروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اچھل کر رہ گئی۔ اچھا تھا پیڈ چھپا تو لیا تھا۔

”لیس“۔ الماری سے بنتے ہوئے اس نے اپنے آپکو سنبھالا۔

یہ تھا۔ ناشتے کی نرے لئے اندر آیا۔

گارڈز ہوتے ہی ایسے ہونگے۔ بہر حال۔ ذرا غور کیا تو کچھ فاصلے پر جہاں وہ گھوڑے کے ٹاپوں میں آئی تھی اسکا پینٹنگ برش پڑا نظر آیا۔ آگے بڑھ کر اس نے اٹھا لیا۔ برش کو مٹی سے صاف کرتے کرتے اس نے دیکھا گارڈ نہایت چوکننا ہو کر اسکے ہاتھ میں پکڑے برش کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ہنسی آگئی۔ جیسے اس نے برش نہیں کوئی بم تھام رکھا تھا ہاتھوں میں۔ خیر۔ اسے برش کیساتھ پہلی بار یاد آیا وہ تو یہاں پینٹنگ کے بہانے سے تھکی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔ سفید ڈیزی کے پھولوں سے انی ڈھلان۔ جیسے پھول ہی پھول تھے اور بس!

وہ جب بھی اس پہاڑی علاقے میں آئی تھی ڈیزی سے لدے ڈھلانوں کو دیکھ کر جی چاہا تھا اتار لے سب کو ایک دن کیسوں پر۔ اس وقت اسکے پاس کیسوں تو نہیں تھا مگر۔ گتے کا ٹکڑا، بکڑی کی ہی سٹخ پر وہ ان ڈیزی کو اتار سکتی تھی۔ رنگ اور برش تو تھے ہی پاس۔ کسی وقت کرنے کی کوشش!

ادھر ادھر گھوم پھر کر وہ کافی دیر بعد کمرے میں واپس آگئی۔ شام کی چائے کیساتھ اس نے دوائی لینی تھی۔

کمرے میں داخل ہوئی تو دھر پر فیوم کی مہک نے توجہ کھینچ لی۔ پہلے بھی یہی مہک وہ محسوس کر چکی تھی پر۔ کہاں؟ اس نے ذہن پر زور دیا۔ یاد آیا۔ فخر عالم اسے گھوڑے پر بٹھا کر گھرارہا تھا تو یہی مہک اسکے جسم میں سے آرہی تھی۔

کیا فخر عالم آیا تھا اسکے کمرے میں؟ اس نے حیرت سے سوچا۔

یکدم ہی جانے کیوں وہ الماری کی طرف بڑھی، اخبار کی تہہ ٹولی۔

”اوہ۔“ اس نے جیسے نجات کی سانس لی۔ اسکا پیڈ اور نوٹس اپنی جگہ پر موجود تھے۔

پھر وہ مسکرا دی۔ وہ بھی کتنی گھبرا گئی تھی۔ فخر عالم کا الماری میں اخبار کی تہوں میں کیا

کام؟

پر۔ وہ آیا ضرور تھا۔ شاید اسکی حالت دریافت کرنے۔ یا پھر اسے یہاں سے چلنا

اور پانچویں دن Stitches کھلیں گے۔ تین چار دن بعد۔“

تین چار دن جانے وہ یہاں رہتی رہتی بھی تھی یا نہیں؟ ویسے وہ بھی عجیب بن بلائی مہمان تھی۔ نالی میزبان نے کبھی مڑ کر پوچھا تھا کہ وہ کیوں آئی تھی؟ کب جائیگی؟

”آپ۔ بولا کریں۔ چلا پھر کریں۔“

وہ دیر سے مسکرا دی۔

”یہ اتنے خوبصورت دانت۔ چھپانے کیلئے تو نہیں ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

گو اسکی بات میں سادگی تھی۔ کوئی معنی نہ تھی۔ پھر بھی دھنک کارنگ سرخ سا ہو گیا۔

ڈاکٹر چلا گیا۔

آج واقعی گھر میں گہما گہمی ہی تھی۔ بقول ملازم فخر عالم اپنے دوست کو لینے خود اتیر پورٹ

کیا تھا۔

اور پھر دوپہر تک جو دونوں آپہنچے تو جیسے ہنگامہ سا برپا ہو گیا گھر میں!

ادھر ادھر گھومتے گھماتے۔ اس نے پہلی بار فخر عالم کے جاندار قہقہے سنے۔ پہلی بار

بے مکان بولتے سنا۔ پہلی بار کسی سے بے تکلفی سے باتیں کرتے سنا۔

آج وہ دوپہر کو سوئی نہیں۔ یوں ہی جنگل میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ پائینز کی مخصوص

خوشبو، سفید ڈیزی، خود رو گلابی رنگ کے چار پتیوں والے ننھے ننھے سے پھول، سرائٹھائے

لوٹے لوٹے Snake plants اور پھر ایک نوخیز چھوٹی چھوٹی پتیوں والی جھاڑی میں

لگے سفید منے منے ستارہ نما چنبیلی کی خوشبو والے ان گنت پھول۔ وہ آگے ہی آگے

بڑھتی گئی۔

اس نے نوٹ کیا مختلف جگہوں پر مسلح گارڈز متعین تھے۔ وہ اس رخ پر بھی گئی جہاں سے

اس نے دریا پار کیا تھا، آئی کے گھر کا تعین بھی ہو سکتا تھا وہاں سے۔ پھر وہ جگہ جہاں

سے وہ لڑھک کر فخر عالم کی طرف گئی تھی۔ ایک گارڈ آج یہاں بھی موجود تھا۔ اس نے محسوس

کیا ہر گارڈ اسے پراسراری نظروں سے گھور رہا تھا۔ شاید فخر عالم نے چوکس کر دائے تھے یا پھر

”وہ سامنے فون رکھا ہے میڈم۔“ پیرا سے ہال میں داخل ہوتے ہی اشارے سے فون دکھا کر واپس چل دیا۔

وہ ہال میں بنی خوبصورت کارپنڈ چوڑی میز میوں کے قریب سٹینڈ پر رکھے فون کی طرف بڑھنے لگی۔

معاہدگی نظر اور میز میوں کے لینڈنگ پر لگی۔ فخر عالم تھا۔ ڈارک گرے قیمتی سوٹ میں لمبوس آہستہ آہستہ میز میاں اتر رہا تھا۔ اور۔۔۔

دھنک کورات والا واقعہ یاد آیا۔ ایک منجھ کر دینے والی بی بی لہر اسکی ریڑھ کی ہڈی میں سے تیر گئی۔ پھلی پھلی آنکھوں سے وہ اسے دیکھنے لگی۔

اس وقت اسکی نظروں میں وہ اجنبیت نہ تھی جو پہلے دن تھی۔ چہرے پر وہ سنجیدگی نہ تھی جو اس دن تھی۔ مضبوط جڑے بھی اس سختی سے جڑے نہیں تھے جیسے کل تھے! اسکی کچھ ہمت بندھی۔

”گڈ ایوننگ میم۔“ پاس آتے ہوئے وہ بہت دوستانہ انداز میں بولا۔

فخر عالم۔ بات کرے۔ وہ بھی ایسے نرم انداز میں!

”ہیلو۔“ اچھا تھا وہ بکلائی نہیں، آواز پر قابو پالیا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپکی؟“ اسکے پرکشش لبوں پر مبہمی مسکراہٹ تھی۔

اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، وہ مسکرایا بھی تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ جھینگ بو۔“ اسکے چہرے پر حیرت ضرور تھی۔

”آپ۔۔۔ یہاں کیسے؟ میرا مطلب ہے۔۔۔“ موبوم سی مسکراہٹ اب بھی اسکے لبوں کو چھو رہی تھی۔

”وہ۔۔۔ ایک فون کر سکتی ہوں؟“ اس نے اجازت تو بہر حال لینی تھی۔

”او۔۔۔ Sure“ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھا۔

دھنک نے ٹرک بنگ سے اینڈ میٹر کا نمبر ملانے کو کہا اور وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

کرنے۔

تجبی وہی صبح والا پیرا قیوم اسکی شام کی چائے لے آیا۔

چائے کیساتھ ہنر برف اور بسکٹ تھے۔ جانے اس خاطر تو وضع کی فخر عالم کو خبر بھی تھی؟ وہ اندازہ نہ کر سکا!

”میں ایک ضروری فون کرنا چاہو گی۔“ اس نے قیوم سے کہا۔

”جی ضرور کیجئے۔ یہاں اس فون سے تو آپ ڈائریکٹ بات نہیں کر سکیں گی۔ ہمارے

آپریٹر سے کہنا پڑیگا۔ ہاں اور ہر صاحب کے فون سے آپ بات کر لیں۔“

”ہوں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

آپریٹر کو نمبر ملانے کی غلطی تو وہ نہ کر سکتی تھی۔ کہ فوراً پتہ چل جائیگا کہ اس نے میگزین کے

دفتر میں فون کیا تھا۔ پھر کون جانے آپریٹر ساری بات سن بھی رہا ہو۔

رو گئی فخر عالم کے فون سے بات تو۔

”مسٹر فخر عالم کے فون سے بات ہو سکتی ہے؟“ اس نے شاید تصدیق چاہی۔

”ہاں۔ کیوں نہیں۔“ وہ اعتماد سے بولا۔

”تم ذرا ٹھہر کر آنا چائے جیتا ہوں پھر تم میرے ساتھ گھر تک چلنا۔“ وہ اس سے قبل فخر عالم کے گھر گئی نہیں تھی۔

کچھ بعد پیرا آیا تو اسے ساتھ لے کر فخر عالم کے گھر کی طرف چلا۔ کہہ اتنی تھی کہ گھر کے

سامنے والے لنگڑی کے ہل پر چلنا تو کجا اسے ساتھ ساتھ چلنا قیوم بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس

ہل پر روشن کعبے کی نوک لائیٹ ہی راستے کا تعین کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی

گئی۔ ہال کے دروازے کے قریب پہنچے پہنچے کہہ چھٹ گئی۔ اب سب صاف نظر آ رہا تھا۔

باہر بادل اور کہہ کی وجہ سے دھند لگے کے سب ہال میں بیک وقت کرشل کے کئی قیمتی

فالوئس روشن تھے۔ اسکے پاؤں کے نیچے فالین بہت گداز تھے۔ دیواروں پر لگی پینٹنگز بہت

مضبوط تھیں اور۔۔۔ جا بجا ایستادہ عکسوں میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ وہ آگے بڑھی۔

"You're welcome." فخر عالم نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

اسکے کان تو جیسے واقعی اسی پر لگے تھے!

بچے کے قدم اٹھاتی وہ باہر نکل آئی۔

رات اس کا ذہن بھی خاصا پرکھ لیا تھا۔ یوں تو روز ہی لگتا تھا وہ کوئی خاص مہمان تھی، اور خاص

تواضع ہو رہی تھی اسکی مگر آج کچھ زیادہ ہی توجہ دی گئی تھی۔ فخر عالم کا خاص دوست جو آیا ہوا تھا۔

کھانے کے بعد وہ بستر میں لیٹے لیٹے ہی ٹیلی ویژن پر نمودار ہوئی رہی۔ نمودار ختم ہوئے تو وہ

اشی۔ ٹی وی بند کیا۔ کپڑے تبدیل کئے، ٹائیڈ سوٹ پہنا اور بستر میں گھس گئی۔

آنکھیں بند کر کے وہ سونے کی کوشش کرنے لگی مگر۔

اچانک فخر عالم اور اسکے دوست کے فلنگ ڈکاف قبضہ کانوں میں پڑے۔ چند لمحوں تو وہ

یوں ہی لیٹی سنتی رہی۔ پھر جانے جی میں کیا سائی؟

اشی۔ جی نہیں جلائی کہ جنگل میں جا بجا ایستادہ سٹریٹ لیمپس کی کمرے میں آتی مدھم

روشنی ہی کافی تھی۔ اس نے ٹائیڈ سوٹ کے اوپر ہی جیکٹ پہنی، اپنا ٹائڈ سائپ ریکارڈر اٹھایا

اور آہستہ سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

سیاہ بالوں نے چہار سولہ بول دیا تھا۔ اونچے اونچے سر فلنگ چیز دو یودار کے درخت

چپ چاپ ایستادہ تھے اور جموں پز دنیا گل کی بالکونیوں میں سے چمن چمن کر آتی مدھم روشنیاں

بہت پر اسرار لگ رہی تھیں۔

قبضہ فخر عالم کے گھر کے اوپر کی منزل سے آرہے تھے۔ اسکا بیڈروم شاید وہیں تھا۔ وہ

سوچ میں پڑ گئی۔ اوپر کیسے جائے؟

پھر جیسے ذہن میں ترکیب آئی۔ جیکٹ اتار دیں پھینک دی کہ وہ جیکٹ میں پھرتی

سے کام نہ کر پاتی۔ اوپر اس ہانگنی کو ایک نظر دیکھا جہاں سے اب بھی قبضہ آرہے تھے۔ چہل

اتارے اور احتیاط سے قریب ترین پائین کے درخت پر چڑھنے لگی۔ پائین پر چڑھنا کوئی

خاص مشکل نہیں تھا۔ اوپر پہنچ کر وہ ہائل ڈھیرے سے ہانگنی میں اتر گئی۔

دو دنہ آپریٹ کرنے کہا کہ باوجود کوشش کے پائین مل نہیں رہی۔ اس نے ایک آخری کوشش

کرنے کو کہا اور بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ یہ فون بہت ضروری تھا۔ وہ بے چینی کیساتھ

ساتھ پریشان بھی تھی۔ اتنی دیر سے فخر عالم بھی وہیں ہال میں موجود تھا۔ بک ویلف میں کوئی

کتاب دھنڈ رہا تھا۔ مگر کال مل بھی گئی تو وہ بات کھل کر کر بھی سکے گی یا نہیں؟

"نورین... نورین... فون کی گھنٹی بجی اور۔"

اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔

کال مل گئی تھی اور انکل اشفاق پائین پر تھے۔

"ہیلو۔" اس نے دھیرے سے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "دھنک بول رہی ہوں۔"

لفظ "دھنک" پر ہی شاید فخر عالم نے مڑتے ہوئے اس پر سر سے لیکر پاؤں تک ایک نظر

دالی تھی۔

"ہاں بیٹے سناؤ کیا حال ہے۔ خیریت سے تو ہونا۔" چیف ایڈیٹر اشفاق نے پوچھا۔

"جی بالکل خیریت سے ہوں۔"

"کوئی پروگرام ہے؟"

"وو... وو... فخر عالم کمرے سے ہال کے پرلے سرے پر صوفے میں بیٹھا ایک

کتاب کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ وہ کیسے بات کر سکتی تھی؟

"ہیلو۔ ہیلو... ایڈیٹر تھے۔" خیریت تو ہے نا؟ کب آرہی ہو؟"

"بالکل خیریت ہے۔ آجاؤ گی۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔" وہ خط بھیج دی گی یہ وہ چاہتے ہوئے

بھی نہ کہہ سکی کہ فخر عالم کی نظریں نہ کسی کان ہی اس پر لگے ہوئے تو؟ "اچھا خدا حافظ۔" اور

دھنک نے ریسیور اٹھ کر ریڈل پر رکھ دیا۔

فخر عالم کی موجودگی میں وہ کچھ نہ کہہ پاتی تھی۔ اب تو بس ایک ہی راستہ تھا۔ تمام پروگرامیں

خط میں لکھ کر بھیج دینا۔

"تھینک یو سوچ۔" اس نے فخر عالم سے کہا۔

دل دھک دھک ضرور کر رہا تھا۔ کہ وہ زندگی میں پہلی بار کسی شخصیت سے گھبرائی تھی۔ خوفزدہ ہوئی تھی۔

شاید اسلئے کہ اس سٹیٹنگ پر سٹیٹنگ کے پیچھے کئی راز پہناں تھے، کئی اسرار پوشیدہ تھے۔ اس نے آہستگی سے آنکھ کھلی کھڑکی کے کونے سے اگلی۔ وہیں بالکل کھڑکی کے قریب دونوں ویز کالین پر نیم دراز گاؤنگیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں شراب کے گلاس تھے۔ اور دونوں کو خوب چڑھی ہوئی تھی۔ مست مدہوش لگ رہے تھے۔ ایک اور پوائنٹ! چند اسم قاتل شراب کا بھی رسیا تھا! وہ بوجھلای گئی۔

کس آس پر اسے ایسے لوگوں میں گھرے رہنا مناسب تھا؟ اگر اسی شخص نے اسے کوئی نقصان پہنچایا تو؟ اگر وہ قتل کر سکتا تھا تو کسی لڑکی کی عزت اسکے سامنے کیا وقعت رکھتی تھی؟ پھر اس وقت وہ بالکل اپنے آپے میں نہیں تھا۔ اگر اسے معمولی سا بھی شک ہو اور اسے دیکھ لیا تو؟ مگر اسے اسکی بہن کے قتل کے بارے میں بھی تو معلوم کرنا تھا!

نہیں۔ دماغ نے مشورہ دیا۔ یہ وقت مناسب نہیں تھا! چلنا چاہیے اسے۔ وہ بے پاؤں مڑنے لگی۔

”یار... کس ہوشیاری سے جان... بچائی ہے... تو نے...“

فخر عالم کے دست کے ہکلائے ہکلائے الفاظ نے اسکے مڑتے قدم ہروک لئے۔ کہیں یہ اشارہ فخر عالم کی بہن سمینہ کے قتل کی طرف تو نہیں تھا؟

وہ ہروک کر کھڑی ہو گئی۔ ٹیپ ریکارڈر آن کر کے چپکے سے کھڑکی کی جالی سے لگایا۔

”جیسے ہی چیز ہے بھائی پیر... پیسے کا کمال ہے سارا۔“ فخر عالم بھی ہکا مار رہا تھا۔

”مگر... تجھے... تیرے بری ہونے پر مبارکباد دینے آیا ہوں... ہے نا...“

”جی معلوم ہے۔“

”یہاں چھوڑ گیا پتہ کاٹ دیا اسکا... کروڑوں ازیوں کی ملکیت میں... جسے بخرے چھوڑے“

معلوم نہیں ہوتے... بنا ہے تیرے ہی بیڈروم میں تھی... تیرے ہی بستر پر...“

”ہاں... میں کبھی اچھی موڈی لاتا تھا تو وہیں میرے بستر میں گھس کر دیکھ لیا کرتی تھی... اس رات بھی ایسا ہی ہوا... فلم دیکھ کر سو رہی تھی... میں دیر سے گھر لو... موقد اچھا تھا بس... مار دیا۔“

”چا تو سے؟“

”ہاں۔“

”فنگر پر تھس؟“

”ارے بھائی۔ اب اتنا بھی بیوقوف نہیں ہوں کہ... فنگر پر تھس چھوڑتا۔“

”اچھا کیا یہاں آگے۔ تمہوڑا سکون ملے گا۔“

”واقعی یار ذہن کا بوجھ کم ہو رہا ہے۔“

”ٹررن... ٹررن...“ اچانک قریب کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

فخر عالم کوشش کر کے آگے بڑھا۔ ریسور اٹھایا۔ پھر کان سے لگایا۔ پھر بنا کر تمہوڑی دیر اسے گھورتا رہا۔ پھر کان سے لگایا۔

”یس فخر عالم سہیلنگ۔“ لہجہ وہی ہکلا یا ہکلا یا تھا۔

”کیا؟“ وہ قدرے ہوش میں آیا۔ ”مال بکڑا گیا؟ کس کی ڈیوٹی تھی؟ شٹ اپ یو۔ ایڈیٹ۔ ڈرائے فرداٹ کے کرشس کے اندر رکھے چھوٹے چھوٹے بیٹز کا کسی کو کیسے پتہ چل گیا؟“

تمہوڑی دیر وہ اور فون کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہا۔ پھر ریسور رکھ کر دوبارہ دوست کی طرف متوجہ ہوا۔

”یار تو نے کہا تھا اسلئے آئیگی آغوش گرم ہوگی... مگر اسکا ابھی تک کوئی پتہ ہی نہیں۔“

فون کر دوتا...“

اور... دھنک کا جیسے مزہ پارا نہ رہا۔ کونسی خوبی تھی جو اس آدمی میں نہیں تھی۔ ایک

ذوق کیا وہ تو لاکھوں کے قتل کا بندوبست کئے ہوئے تھا۔ قاتل تھا، سمگلر تھا، عورتوں کا رسیا تھا! ٹیپ ریکارڈ ریزند کرتے ہوئے وہ سن سادماغ لئے آہستہ آہستہ درخت پر سے اترنے لگی۔ مگر۔

ساتھ ہی اطمینان بھی ہوا۔ اتنی جلدی اور اتنی معافی سے اسے ہر بات پر پتہ چل جائیگی۔ اسکے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت ترین رپورٹر سمجھ رہی تھی۔ کل صبح ہی وہ یہ تمام نوزائیدہ لکھ کر ایڈیٹر کو پوسٹ کر دیگی۔ کتنے خوش ہوئے گئے وہ؟ کتنا نام ہوگا اسکا؟ رات بھر وہ خوشی کے مارے ٹھیک سے سو بھی نہ سکی۔

صبح سویرے اٹھ کر اس نے اوٹن گرین گرم کپڑے نکالے اور جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ خوبصورتی سے بندھے ہال اور کپڑوں کے ہر رنگ شوژ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ الماری سے پیڑ اور پین نکال کر وہ رات والا واقعہ قلمبند کرنے لگی۔

”وہ قاتل ہے، سمگلر ہے، شرابی ہے، عورتوں سے کھیلا ہے، کرپٹ ترین انسان ہے...“ اور تمام صفحات اکٹھے کر کے لفافے میں ڈالے، ہفتہ وار آئینہ کے ایڈیٹر کا ایڈریس لکھا اور پیرے کا انتظار کرنے لگی۔

تبھی قیوم بیڈٹی لئے اندر آیا۔

”گڈ مورنگ میڈم“۔ اس نے چھوٹی سی ٹرے اس کے آگے میز پر رکھی۔

”گڈ مورنگ“۔

پیرا او ایلن ٹرنے لگا۔

”سنو قیوم“۔

”جی“۔ وہ دو بارہ مڑا۔

”یہ خط ہے بہت ضروری اسے آج ہی نکل جانا چاہیے۔ ہوں۔“

”جیسا حکم۔“ اس نے لفافہ لے کر جیب میں رکھ لیا۔

دھتک نے اسے خط چھپانے وغیرہ کی تاکید نہیں کی۔ کہ خود سے بھی شک ہو سکتا تھا۔

”اور ہاں آجکا اخبار۔“ وہ نرمی سے بولی۔

”ابھی لایا سرکار۔“ اور وہ چل دیا۔

اسکے ذہن کا بوجھ قدرے کم ہوا۔

گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پینے لگی۔

اسے خود بھی یہاں سے جلد سے جلد چلے جانا چاہیے۔ مگر کم از کم آج نہیں۔ یہ نہ ہو مگر عالم کو کوئی شک پڑ جائے۔ یا کسی کو بھی۔ آج کا دن مناسب نہیں تھا۔ اسکے سچڑ کھانے میں ابھی دقت تھا۔ مگر سچڑ وہ کہیں اور سے بھی کھلا سکتی تھی۔ وہ کسی طرح اس جال سے بھول بھلیوں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

خالی کپ میز پر رکھ کر جیکٹ پہن کر وہ باہر نکل آئی۔ ناشتہ آنے میں ابھی ویسے بھی دیر تھی۔ وہ گیٹ ہاؤس کے پیچھے جنگل میں نکل گئی۔

جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیکھے سوچوں میں گم وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔

معائنات اٹھا کر دیکھا۔ فخر عالم تھا، بمعہ اپنے خونخوار کتے کے۔

اس وقت پھر وہ اسے دیکھ کر کانپ سی گئی۔ یہ مگر یک گوڈا اپنے اندر کتنے گھناؤنے جرم

چھپائے تھا

اس نے خود کو سنبھالا۔

”گڈ مورنگ“ وہ خوشگوار سے بولا۔

”ہیلو“ اس نے بھی دھیرے سے کہا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ دوزی سے پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہوں۔ شکر یہ۔“

”سچڑ کب کل رہے ہیں؟“ اس نے مزید پوچھ لیا۔

اور دھنک کو لگا وہ اسے چٹا کرنے کی سوچ رہا تھا۔

بات ٹھیک بھی تھی۔ وہ یہاں کوئی بلائی گئی مہمان تموزی تھی۔

”دو تین دن بعد مگر میں... کل چلی جاؤ گی۔ میری طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے۔“

ایک لمحہ کو وہ چپ سا ہو گیا۔

”ڈاکٹر سے بات کی ہے کل جانے کی۔“

”آج آئیے تو کروں گی۔“

تبھی۔۔ اچانک کہیں سے فخر عالم کا دوست کامران آنکلا۔

”یار اتنی سردی میں کیا کرنے نکلے ہو۔“ وہ اوڈور کوٹ کے اوپر گرم ٹوپی پہنے سردی سے ٹھنھرتے ہوئے بولا۔ پھر جیسے یکدم ہی دھنک پر نظر پڑی۔ ”اوہ۔۔ ہیلو۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا

مناات سے بولا۔

”ہیلو۔“ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”ارے۔۔ آپکے دانت کچھ زیادہ ہی خوبصورت نہیں ہیں؟“

وہ سرخ سی ہو گئی۔

”میں ہمیشہ سچ بات کہتا ہوں۔ آپ تمام کی تمام یعنی ساری کی ساری بہت خوبصورت ہیں اور خوبصورت چیز کی تعریف نہ کرنا کفران نعمت ہے...“

اس دوران فخر عالم بالکل سنجیدہ تھا۔

”اب جاؤ۔۔ ناشتہ لگ چکا ہوگا۔“ اس نے کامران کو مخاطب کیا۔

”ٹھنھر دیا ربات کرنے دو۔“ بائے داوے آپکا نام کیا ہے مس؟“

”دھنک۔“ وہ دونوں دوستوں کی کھینچا تانی پر پھر مسکرا دی۔

”یعنی تو س دقزح یعنی رین بو۔ گوڈ۔ کتنا حسین نام ہے۔ کیوں فخر عالم؟“

وہ خاموش رہا۔ جھکتے ہوئے اپنے کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

کامران کی عقل میں شاید آئی گیا کہ فخر عالم اس معاملے میں کوئی رائے دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

”اچھا Pretty lady ہم چلتے ہیں۔ یہ مجھے زبردستی لے جا رہا ہے ورنہ میرا دل

نہیں چاہتا ایسی Doll like لڑکی کو چھوڑ کر جانے کو۔“

وہ اسکی صاف دلی پر مسکرائے بنانہ رہ سکی۔

”باپ رے یہ دانت، دکھانا ذرا فخر عالم کو یہ بھی یہیں رہ جائیگا۔“

READ ME
PASTA

”چلو“ فخر عالم سیدھا ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

اور۔ دونوں ہل دیئے۔

دھنک دیر تک ادھر ادھر گھومتی رہی۔ پھر ناشتے کیلئے واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ لگتا تھا فخر عالم اور کامران دونوں اس کی طرف سے ہوتے ہوئے گزرے تھے۔ کیونکہ آج پھر فخر عالم کی مخصوص پرفیوم کمرے کے باہر سے لیکر اندر تک مہک رہی تھی۔

ناشتہ میز پر لگ چکا تھا۔

وہ دیرے دیرے نوٹس پر ٹکسن لگانے لگی۔

تجھی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اٹھ کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر آتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

”ہی۔“

”سوری میڈم! آج اخبار نہیں آیا۔“ قوم تھا۔ معذرت خواہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”اوہ۔ کوئی بات نہیں۔“ حالانکہ اخبار کے بغیر اسکا دن گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔

”اور کوئی حکم میڈم؟“

”کوئی نہیں۔“

اور ریسیور کھتی ناشتے کی میز پر آگئی۔

ناشتے سے فارغ ہوئی ہی تھی۔ کہ ڈاکٹر آ گیا۔ ساتھ میں فخر عالم بھی تھا۔ گے

پیش اور گے جتنی ہل ادا کرنے پر ہمیشہ کی طرح شاعرانہ رنگ رہا تھا۔ وہی پہلے دن والی بے

نیازی سے کھلی کھڑکی کے ہٹ سے نکل کر باہر جنت نشان نظاروں کو دیکھ رہا تھا۔

”ڈاکٹر! میں کل واپس جانا چاہتی ہوں۔“ دھنک نے آہستہ سے ڈاکٹر سے کہا۔

”کیوں؟“ وہ اسکا ہاتھ ہاتھ میں لئے کلائی کے پاس کے نیل دیکھ رہا تھا۔ جیسے

چمکتے ہوئے بولا۔

”کافی وقت ہو گیا۔ یہاں نیچے میری آئی رہتی ہیں انکے یہاں بھی جانا ہے۔ پھر

واپس بھی لوٹنا ہے۔“

”نہیں۔ آپ نہیں جاسکتیں۔“ ڈاکٹر اسکی آنکھوں میں جھانکا۔ اور۔

فخر عالم نے اچانک رخ اندر کی طرف کر لیا۔

دھنک کا ہاتھ اب بھی ڈاکٹر تھامے تھا۔

اب بھی اسکی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ہاں البتہ دھنک کی آنکھیں جھک گئی تھیں،

سیاہ خمیدہ پلکوں نے آنکھوں پر سایہ کر لیا تھا۔

”کیوں ڈاکٹر؟“

اسکا لہجہ کچھ درشت سا تھا جیسے۔ یا پھر یوں ہی دھنک کا خیال تھا۔ نگاہیں اٹھا کر اسے

دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر نے دھنک کی کلائی چھوڑ دی۔

”وہ۔ مر! جس ڈاکٹر سے ٹانگے لگے ہوں وہی کھول دے تو ظاہر ہے بہتر ہے۔۔۔“

کوئی بات تھی جو ڈاکٹر گھٹی سا لگ رہا تھا۔

”ہوں۔“ کچھ تھا اسکے لب و لہجے میں، اسکی نظروں میں۔ تسمیہ، ممانعت سی۔ جسے

دھنک نظر انداز نہ کر سکی مگر۔

کوئی نام بھی نہ دے سکی۔ کہ اس نے فوراً رخ واپس کھڑکی کی طرف کر لیا تھا۔

”اوکے ڈاکٹر۔ سچو کھولنے پھر آ جانا۔“ کہتے ہوئے وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا باہر

نکل گیا۔

”مصلحے اب تو مسٹر فخر عالم نے بھی کہہ دیا ہے۔ اب تو آج پھر کنا ہی پڑیگا۔“

وہ نہ تو مسٹر فخر عالم کی پابند تھی۔ نہ ہی اس ڈاکٹر کے بدلے بدلے روپے کی۔

لیکن وہ چپ رہی۔ کیا کہتی؟

رات مطلع صاف تھا۔ پورا چاند جنگل، کوٹھی اور گیٹ ہاؤس کو نرم و نچ چاندنی سے منور

گھروالے بھی۔“

گھروالے کہہ کر اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ کہ وہ یہ تو کہہ نہیں سکتی تھی کہ وہ پریس کے مشن پر آئی تھی اور اب اس کا مشن پورا ہو چکا تھا۔ اب مزید یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔
”سچ تو کہیں بھی کھلوانے جاسکتے ہیں۔“ اس نے مزید کہا۔

”نو۔“ اسکے لہجے میں اچانک تیزی آگئی۔ ”تکلم آگیا۔“ سچ یہیں کھلیں گے۔ اور جب تک تم کھل ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ نہیں جاسکتیں یہاں سے۔“

اور — وہ اچانک مڑ کر چل دیا۔

وہ حیران سی اسے بکتی رہ گئی۔

کر ہاتھا۔ چیز و منور کے اونچے اونچے درختوں میں سے جھانکتا یہ بڑا چاند۔ جیسے پورے ماحول کو سحر میں لے رکھا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جینٹ پہنتے ہوئے باہر نکل آئی۔ تھوڑا آگے نکلنے ہوئے چیز کے درخت سے ٹک لگا کر اوپر چاند کو تکتے لگی۔
تبھی قریب ہی قدموں کی آہٹ ہوئی۔

اس نے چونک کر دیکھا۔

دو دھیا چاندنی میں ہائیٹ سوٹ پر ہانف لینتھ گرم گاؤن پہنے جیبوں میں ہاتھ دیئے فخر

عالم آ رہا تھا۔

”آپ... اس وقت... یہاں کیسے آئی ہیں۔“ وہ ملائمت سے بولا۔

”جیسے... آپ آئے ہیں۔“ جانے کیسے اسکے منہ سے نکل گیا۔

”او۔“ اسے جیسے اچھا لگا۔ ”میں تو چاند دیکھنے آیا ہوں۔“

”میں بھی چاند دیکھنے آئی ہوں۔“

”پہلے اس ایک بات میں تو ہم دونوں میں اتفاق ہے۔“

وہ چپ رہی۔ چاند کو بکتی رہی۔

”یہاں آچو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔“ اس نے پھر کہا۔

”جی نہیں۔ بلکہ میں آپ کی بہت تعجب فل ہوں۔ مجھے بہت آرام ہے یہاں۔“ اس

نے اسکا شکر یہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔

”اگر آچو یہاں آرام ہے تو پھر جانے کا کیوں کہہ رہی ہیں۔“

دھنگ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ چٹان سے ترشابت پھسل کیسے رہا تھا!

”جانا تو ہے نا۔“

”وہ تو ہے پر۔“ وہ جیسے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ ”اپنے سچ تو کھلوا کر جانیے۔“

”مجھے آج یہاں تین دن پورے ہو گئے۔ میری آنٹی پریشان ہو رہی ہوگی اور... اور...“

کے پتلے پتلے تنے بنائے۔ پھر نازک نازک شاخیں۔ اور پھر ہر شاخ کے اوپری سرے پر ڈیزی کے سفید پھول کی جگہ برش سے سفید دھبے بناتی گئی۔ بعد میں وہ انہیں باقاعدہ ڈیزی کے پھولوں میں بدل لیتی۔ پھر اچانک خیال آیا اسکے آس پاس بھی چند پھول آگے تھے۔ ان میں سے ایک توڑ کر وہ اسے تفصیل سے بنا لیتی۔ کتنی چیزیں تھیں اس میں، درمیان والی زردی کا کتنا حصہ تھا وغیرہ۔ بعد میں پھر باسانی باقی پھولوں کو اس کی شکل کا بنا سکتی تھی۔ لکڑی کا پس اور برش پینٹس وغیرہ پتھر پر رکھ کر وہ نیچے اتر آئی۔ ہاتھ بڑھا کر ایک پھول بمعہ کچھ نازک سی شاخ کے توڑ لیا۔

”اول ہوں۔“ جانے کہاں سے فخر عالم آ پہنچا تھا۔ وہی تالیف سوٹ پر خوبصورت ہاف لینتھ گاؤن لئے۔ وہی شرٹ کے اوپر کے چند کھلے ٹین، اس میں سے جھانکتا اسکا مردانہ وجاہت کا غماز سینہ۔ دھنک کی نظریں جھک گئیں۔ ”پھول توڑنا منع ہے تمہیں معلوم نہیں۔“ اسکی جھکی نظروں کو تکتا وہ اپنے مخصوص دھبے لہجے میں بولا۔

”یہ... بھی...“ ان سے تو جنگل بھرا پڑا تھا۔ وہ پودے پر ہنوز جھکی نظریں اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔۔۔ یہ بھی...“ اسکا چہرہ سنجیدہ آنکھیں شوخ تھیں۔ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ دیئے سامنے دیکھ رہا تھا۔

جانے کیوں دھنک کے خوبصورت چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔

اسی طرح پھلے جھکے اس نے پھول کے شاخ کی اسکے باقی حصے کیساتھ گرہ لگالی۔

اور۔۔۔ فخر عالم اسکی اس حرکت پر اچانک زور سے ہنس دیا۔

وہ وہیں بیٹھے بیٹھے حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”نام آتا ہے اسکا؟“ وہ خوشگواہی سے پوچھنے لگا۔

”نہیں۔“ وہ اب بھی وہیں بیٹھی تھی۔ چہرہ پھولا پھولا سا تھا۔ اس نے ’ہاں‘ کہنا

ضروری نہیں سمجھا۔

آج وہ بچے اسکے ہاتھ کھل جانے تھے۔ اسکے بعد اس نے چلے جانا تھا۔ بیڈٹی پی کروہ اٹھی۔ صاف کپڑے پہنے۔ گئے خوبصورت بالوں میں برش کیا۔ جیکٹ پہنی اور کپڑوں پر اپنی پسندیدہ کون سپرے کرتے ہوئے وشاش بشاش سی کمرے سے باہر نکل آئی۔

سامنے ہی مگر خاصی دور ڈھلان پر سفید ڈیزی ڈیزی بکھرے دیکھ کر اسے یاد آیا۔ اٹکا کچھ سا تو کم از کم کسی چیز پر جلدی جلدی اتار لے۔ بعد میں گھر جا کر وہ اسے کیڑوں پر اتار سکتی تھی۔ اس پاس کا ماحول ریف سا اتار لیتی ساتھ ہی دو ایک پھول۔ باقی وہ گھر پہنچ کر کرتی رہتی۔

یہی سوچ کر وہ واپس کمرے میں آئی۔ ناشتے میں ابھی دیر تھی، بلکہ اس نے خود ہی ہرے سے کہا تھا ناشتہ دیر سے لایا کرے۔ بیڈٹی تو وہ ویسے بھی لے چکی ہوتی تھی۔

اپنے برش اور پینٹس لے کر وہ باہر آئی۔ ادھر ادھر لگاہ دوڑائی۔ جلد ہی اسے درخت کے تنے کا گولائی میں منالی سے کتا ہوا کھڑا لگ گیا۔ پرلی طرف درختوں کی کٹائی وغیرہ کا کام ہوتا تھا وہیں سے شاید اھر تک آ پہنچا تھا۔ خلاف توقع اسے اچھی چیز مل گئی تھی۔ تقریباً گول پلیٹ سی۔ ہلکاس پرف کچھ لکیر دگر جا کر کسی کو دست کر لیتی۔ لکڑی کے ٹکڑے پر اور نیچرل لگتا!

جنگل ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر اس نے لکڑی کا کھڑا گھنٹوں پر رکھا اور جلدی جلدی ایک سفید کوٹ دکھانے سے شگ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ گزارے لائق ہوا تو کام شروع کر دیا۔ کہ دوسرے تیرے کوٹ اور زیادہ تفصیل میں جانیکا اسکے پاس وقت نہیں تھا۔ جلدی

جلدی سامنے کے ڈیزی والی ڈھلان کے آس پاس والی کھائی، درخت، ڈھلان کے بیچ میں سے گزرتی پگڈنڈی ڈھلان کے اوپر چلتی پر بنے چند سفید چمکتی ٹین کی چھتوں والے پھولے موٹے مکانات اور پھر ڈیزی کی باری آئی تو ڈھلان پر پہلے تو ان گت بزرگ

"Day's Eye" کہتے ہیں اسکو۔ "وہ اس کے پھولے پھولے چہرے کو دیکھتا

مسکرا کر بولا۔

Day's Eye کا تو اسے واقعی علم نہیں تھا۔ ڈیزی کہتے تھے سب۔

"اور تم جیسوں نے زیادہ لاڈ سے انہیں ڈیزی بنا دیا ہے۔ پینٹ کر کے۔"

وہ ایک نظر اسکی پینٹنگ پر ڈالتے ہوئے آہستہ سے آگے بڑھ گیا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی پینٹنگ پر ڈیزی بنائی اور تمام چیزیں سمیٹ کر کمرے میں

واپس آگئی۔

ناشتہ کیا۔ ٹھیک دس بجے ڈاکٹر نے آکر ناکے کھولے۔ اور اب وہ جانے کو تیار تھی۔

اس نے اپنا مختصر سا سامان اکٹھا کیا۔ بیک کندھے سے لٹکایا اور فخر عالم کے گھر کی

طرف چلی۔ اسکا شکر یہ تو اس نے بہر حال ادا کرنا تھا۔

وہ گھر میں نہیں تھا۔ جنگل میں کام دیکھنے گیا تھا۔ وہ وہیں چل دی۔ بڑے بڑے

درختوں کی مٹینوں سے کٹائی ہو رہی تھی۔ ایک طرف تختے تراشے جا رہے تھے۔ پاس ہی

دریا میں درختوں کے کٹے ہوئے پانی کے بہاؤ کے رخ چلے جا رہے تھے۔

فخر عالم وہیں موجود تھا۔ سچ کمر پینٹ اور سچ ہی رنگ کے فرکی لائیننگ والے جیکٹ میں

لبوں بہت ڈھنگ لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر پاس چلا آیا۔

"مسٹر فخر عالم! میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اور گھر جا رہی ہوں۔" وہ خوشگوار لہجے میں

بولی۔ کچھ ریل کی تو تو میں میں سب بھلا کر۔

"پتھر کھل گئے؟"

"بالکل کھل گئے۔" وہ مسکرائی۔

"ٹھیک۔ اب میں تمہیں روک نہیں سکتا۔" وہ بھی مسکرایا۔

انکی بات کے انداز میں اسکی مسکراہٹ میں بے پناہ کشش تھی، جتنا طبعی قوت تھی۔

کاش وہ اچھا آدمی بھی ہوتا!

"آپ نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔" "I am so grateful to you."

"Oh no, It was no problem at all." تم ہماری مہمان

تھیں۔ مہمان کا خیال رکھنا تو فرض بنتا ہے۔ "وہ قدرے رکا، کچھ سوچا پھر مسکرایا۔ "ہائے

داوے بس تمہارا یہاں نزول کیسے ہوا؟ کہاں سے آئیں؟ کس سلسلے میں آئیں؟" وہ مسکرا

مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

وہ قدرے گڑبڑائی، پھر خود کو سنبھالا۔

"بڑی جلدی خیال آیا۔" وہ مسکرائی۔

"چلو دیر سے کسی بتا دو۔ کیوں آئی تھیں؟ کیسے آئی تھیں؟..." اسکی آنکھوں میں شوخ

سی چمک تھی۔

وہ ہنس دی۔

"آپ تو یوں سب پوچھ رہے ہیں جیسے کوئی پریس رپورٹر کسی کا انٹرویو کر رہا ہو۔"

اور۔۔۔ فخر عالم کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ پریس رپورٹرز سے تو میں خود ارجح ہوں۔"

"اوہ۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "اچھا اب چلتی ہوں۔"

"آپ میرا سوال گول کر گئی ہیں۔"

"آں... میں دراصل... نیچے گاؤں میں اپنی آنٹی کے پاس آئی تھی۔ آپکا جنگل سوشلی

یہ ڈیزی زوالی ڈھلان۔" اس نے اس ڈھلان کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ دونوں اس وقت

کھڑے تھے۔ "مجھے Fascinate کر گئی۔ سوچا پینٹ کر لوں۔ مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ

چند گھنٹوں کی جگہ کئی دن لگ جائینگے۔"

"ہوں؟" اسکی گھنی ہنسی سوالیہ اور پراٹھ گئیں، آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی۔

"جی ہاں۔" وہ مسکرائی۔ "اچھا خدا حافظ۔"

اور۔۔۔ قریب ہی انہی بڑے بڑے پتھروں سے دریا پار کرنے لگی جن سے یہاں آتے

آج ہوئے کراں کیا تھا۔

”خدا حافظ“ فخر عالم نے کہا۔

اور اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

وہ اس پار پہنچی تو غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ فخر عالم وہیں کھڑا تھا۔

ہاتھ سے اسے Wave کیا اور مڑ کر اپنے کام کی طرف جانے لگا۔

دھنک نے بھی ویو کا جواب ویو ہی سے دیا اور تیزی سے آنٹی کے گھر کی طرف بڑھنے

لگی۔ آج شام کی ٹرین سے اس نے واپس جانا تھا۔

اس رات اسے آنٹی نے زبردستی روک لیا تھا۔ اگلے دن وہ شام کو ٹرین میں بیٹھی، وہی دو دن کا سفر۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب وہ اپنے قلیٹ میں پہنچی۔ رات جوں توں کر کے آنکھوں میں کائی۔ اس پر عجیب سی خوشی، مانوگی سی سرشاری طاری تھی۔

آج وہ آفس جا سکی۔ اشفاق انکل اس کا خط پا کر کتے متحیر کتے خوش ہو گئے۔ پھر ڈسکشن ہوئی۔ اور اگلے دن میگزین میں بڑے بڑے حروف میں مسز فخر عالم کے متعلق سرخی چھپے گی، دھنک کے نام کیساتھ!

اور وہ آصف کی بھی تو خبر لے گی۔ کیسے مسز فخر عالم کا سائڈ لیتا تھا۔ سرے سے اسے مجرم گردانا ہی نہیں تھا۔

”تم کیوں اسکے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہو۔ کورٹ نے فیصلہ دے دیا بس دے دیا۔ ضروری ہے بہن قتل ہوئی تو بھائی بھی ختم ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے اسے آصف کے الفاظ یاد آئے۔ اچھا شرمندہ ہوگا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔

وہ صبح صبح تیار ہوئی۔ خاصی خنکی ہو رہی تھی یہاں بھی۔ گرمی دم توڑ چکی تھی اور سمسین بخ بستہ ہو چکی تھیں۔ دن گھٹ رہے تھے اور شامیں سرد ہو چکی تھیں۔

موسم کی مناسبت سے اس نے رنگ برنگے پھولوں والے کپڑے پہنے، بیچ کرتا دوپٹہ لیا، ہلکا سا گرے رنگ کا بغیر آستین سویٹر پہنا اور گھنے خوبصورت ہالوں میں برش کرتے ہوئے کندھے سے اپنا ہینڈ بیگ لٹکاتی لیکن میں فرزانہ کی طرف لگی۔

”قیامت اِحداری ہو آج۔ کس کی شامت آئی ہے؟“ فرزانہ اُسے تو صلی نظروں سے

دیکھتے ہوئے اسکے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے بولی۔

وہ دونوں صبح کے وقت یوں ہی جلدی میں مگن میں ہی ناشتہ کر لیا کرتی تھیں۔

”آج بہت جلدی میں ہوں۔“ اس نے کپ ہونٹوں سے لگایا۔ ”واپس آ کر بتاؤ گی

سب۔“

”یعنی صبح کسی کی شامت آئی ہے؟“

”ہاں۔ وہ مسکرا دی۔“

”کچھ تو بتاؤ نا۔“ اسے تجسس ہوا۔

”کچھ نہیں۔“ سارا اتنا ڈگلی مگر آفس سے آ کر۔ اس نے خالی کپ میز پر رکھا اور۔

دروازے کی طرف بڑھی۔

آفس پہنچ کر وہ سیدھی چیف ایڈیٹر کے آفس میں آ گئی۔

”السلام علیکم سر۔“ وہ خوش خوش بولی۔

”وعلیکم سلام۔ بیٹھو بیٹا۔“ انہوں نے اپنے سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”سناؤ

کیا حال چال ہیں۔ کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں؟“ اپنے سامنے کی کھلی قاتل بند کرتے ہوئے وہ تجسس نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

وہ کچھ الجھی گئی۔ پورا حال تو وہ خط میں لکھ چکی تھی۔ اور کامیابی؟ اس سے بڑھ کر

کامیابی کیا ہوتی تھی؟

”سر خط میں میں نے سارا لکھ تو دیا تھا۔“

”خط؟ کون سا خط؟“

کہیں مرزا ق کے سوڈ میں تو نہیں تھے۔

”سر پلیز! میں آپ کو کئی دن پہلے خط بھجوا چکی ہوں۔ اس میں میں نے ہر بات لکھ دی تھی۔

اپنے مشن میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں یا آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔“

”تمہارا فون آیا تھا وہ بھی کچھ احوال اور اساتذہ۔ لیکن خط تو مجھے کوئی نہیں ملا۔“ وہ سنجیدگی

سے بولے۔

”میرا خط آپ کو نہیں ملا؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

”نہیں بیٹی۔ ملا ہوتا تو میں چھپاتا کیوں؟ ہاں یہ۔“ انہوں نے قرعہ راز کھولا۔ ”ابھی

ابھی تمہارے نام ایک خط آیا ہے۔“ انہوں نے خط کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ تو ٹھیک ہے مگر میرا خط کہاں گیا؟“ وہ پریشان سی لفافہ کھولنے لگی۔

خط انگریزی میں لکھا تھا اور اس کا متن کچھ یوں تھا!

”میڈم رپورٹ!“

تم میرے گھوڑے کے تاپوں میں آ کر گری تھیں تو مجھے سخت حیرت ہوئی تھی۔ میرے

علاقے میں کسی لڑکی کا کیا کام؟ اور وہ بھی بغیر کسی اطلاع یا اپوائنٹمنٹ کے۔ پھر تمہارے

قریب زمین پر گرا پینٹنگ برش دیکھ کر مجھے خیال آیا تم کوئی ٹورسٹ ہو، میرے قاعدے

اصولوں سے ناواقف ہو۔ یہ جنگل یا کوئی سینٹری تمہیں اچھی لگی تھی اور تم اسے پینٹ کرنے آئی

تھیں۔ مگر۔

چوٹوں کی تکلیف سے تم نے خود گی میں جب امی امی پکارا تو میں چونک اٹھا۔ یہ آواز

میں نے کہیں سنی تھی۔ کہاں؟ کسی طرح یاد نہیں آرہا تھا۔ سارا دن بار بار دماغ پر زور دیا۔ مگر

یاد نہیں آیا۔ جبکہ یہ بات اپنی جگہ مسلم تھی کہ تمہاری آواز میری سنی ہوئی تھی۔

میں محتاط ہو گیا۔ اپنے گاڑو ز اور ملازموں کو چوکنا کر دیا۔ اور پھر۔ اگلے دن میرا دوست

کامران آیا تو ہمیں ایک فون نمبر کی ضرورت پڑی۔ جو اس نے کچھلی بار گیٹ روم کے اسی

کمرے میں جہاں تم مقیم تھیں اپنے قیام کے دوران الماری حلیف میں بچھے اخبار کے ایک

کونے پر لکھا تھا۔ میں تمہارے کمرے میں آیا، دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر میں سمجھ گیا تم

کہیں باہر ہو۔ نمبر چونکہ ہمیں بہت ضروری چاہیے تھا۔ اس لئے مجبوراً میں اندر گیا، سیدھا

الماری کی طرف۔ الماری کھول کر اخبار الٹ پلٹ کرنے لگا۔ نمبر بھی مل گیا مگر ساتھ ہی تمہارا

لکھا ہوا نوٹ بھی اور۔

مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا
 'کیا واقعی آپ بے گناہ ہیں یا آپکی بے پناہ دولت آپکو بے گناہ ثابت کرنے میں
 معاون ہوگی ہے؟ آپکی چپ کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہ قتل آپ نے ہی کیا ہے؟' طرہ
 محارت اور زہرا گنتی یہ آواز میرا پیچھا کر رہی تھی۔

میں نے تمہاری قتل تو نہیں دیکھی تھی پر تمہاری آواز میرے لاشعور میں محفوظ ہو گئی تھی
 اور اب میں سمجھتا ہوں کس مقصد سے آئی تھیں۔

میں نے ٹوٹ و ہیں رہنے دیا۔ کہ اب میں سب سمجھ گیا تھا۔ پڑھ کر کوفت تو ضرور ہوئی
 مگر اب میں اس انتظار میں تھا کہ تم کب اسے مکمل کرتی ہو اور کب پوسٹ کرتی ہو۔

میں تم نے رات کو لاش ٹرک میں ڈالتے دو آدمیوں کو دیکھا تھا۔ میں نے بتیاں بھی
 نہیں جھٹائی تھیں، ٹوریج سے کام لے رہا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی کو لاش جھکانے لگانے رقم
 دی تھی ساتھ ہی کچھ ہدایات بھی تو۔

Madam Detective وہ لاش ان دو آدمیوں کی والدہ کی تھی۔ ہارٹ مل
 ہونے سے فوت ہوئی تھیں۔ اور لایمیٹ اس وقت قتل ہوئی تھی میں بتیاں کیا جلاتا۔ ٹوریج
 اسلئے استعمال کیا کہ روشنی کی ضرورت تھی۔ آدمی کو رقم اسلئے دی کہ وہ اپنے گاؤں پہنچ کر اپنی
 والدہ کی جھنڈی دیکھ کر سکے۔ اپنے ہر بندے کی اس قسم کی ضروریات میرے ہی ذمے ہیں
 اسکے علاوہ کسی کو قتل کر کے لاش ٹرک میں ڈھکیلی جاتی ہے۔ سفید چادر سے ڈھانپ کر
 احرام کے ساتھ چارپائی پر نہیں رکھی جاتی۔ بہر حال۔ تمہارا قصور نہیں تم یقیناً اس وقت
 خوفزدہ ہو گئی تھیں۔

پھر تم نے لکھا تھا۔ کہ تم اس انتظار میں ہو کہ کسی طرح تمہیں پر پتہ چل سکے کہ اپنی بہن کو
 میں نے ہی مارا ہے اور یہ کہا ہی دن تم انہیں فون بھی کرنے والی ہو۔

اب میں تو تمہاری حرکات و سکنات پر نظر رکھنے لگا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا تمہارے فون
 کتنے وقت میں مسلسل وہاں موجود رہا تاکہ تم ایڈیٹر کو کوئی اطلاع نہ دے سکو۔ اور۔ اسی

رات میں نے اپنے ہاتھ روم کی کھڑکی میں سے تمہیں درخت پر چڑھتے دیکھا۔ روشنی مدھم
 سہی تمہارے ہاتھ میں نیپ ریکارڈر میں نے دیکھ لیا تھا۔ میں فوراً کمرے میں آیا کامران کو
 جلدی جلدی بات سمجھائی۔ میں شراب نہیں پیتا، صرف تمہیں دکھانے کو میں نے دو گلاسز میں
 کوک ڈالی، اسے بھی پکڑائی اور خود بھی گلاس تمام لیا۔ بہر حال تمہاری ہر مشکل میں نے اسی
 وقت حل کر دی۔ سمینہ میری بہن کے قتل کا اقرار بھی کیا۔ پھر فون کی تمہنی بھی، ریسیور اٹھاتے
 ہی وہ آگے سے بند ہو گیا۔ تم نے دیکھا بھی ہوگا میں چند لمحے ریسیور کو خالی خالی نظروں سے
 دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک خیال آیا قاتل تو سمجھتی ہی ہو سکتی تھی۔ میں بند فون پر ایک سنگلر کی
 ایکٹنگ کرتا رہا۔ رہی سلسلی والی بات تو وہ محض گپ تھا اور کچھ نہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں
 تمہیں یہ قوف بنانے کیلئے میں کیا کیا نہ بنا؟

میری عین توقع کے مطابق تم نے خط مکمل کر کے قیوم کو پوسٹ کرنے دیا۔ وہ میں نے
 اس سے لے لیا۔ پوسٹ ہونے نہیں دیا۔ اور تم اپنا شپ ریکارڈر بھی دیکھ لو۔ اہل میں ہلینک
 کیسٹ ہوگا۔ تمہارا والا میرے قبضے میں ہے۔ تمہارے کمرے میں آکر میں نے بدل لیا تھا۔
 'وہ قاتل ہے، سنگلر ہے، شرابی ہے، عورتوں سے کھیلتا ہے۔ اتنے بہت سارے اور اتنے
 خوبصورت Compliments کیلئے میں تمہارا مشکور ہوں۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر
 میں اتنا پست و ذلیل تھا تو تم کیسے یہاں حفاظت سے رہ پائیں؟

تمہیں چند روز قبل اخبار پڑھنے کو نزل نکلا۔ اسی اخبار کی ایک کٹنگ اس خط میں بھیج رہا
 ہوں۔ تم پر واضح ہو جائیگا کہ اخبار میں نے کیوں روکا تھا۔"
 خط چھوڑ چھاڑ اس نے اخبار کی کٹنگ جو میز کے نیچے جاگری تھی اٹھالی۔

سمینہ قتل کیس کے ملزم نے اقبال جرم کر لیا۔
 سرخی کے بعد اس نے تفصیل پر نظر دوڑائی۔

سمینہ کا سنگیتر جوارسکا ماموں زاد بھائی تھا۔ سمینہ کا قاتل تھا۔ واصل قاتل کا نشانہ سمینہ کا بھائی
 مسز فخر عالم تھا۔ فخر عالم کو شتم کر کے وہ سمینہ کے ذریعے تمام جائیداد کا واحد مالک بنا چاہتا تھا۔

مگر بد قسمتی سے مسز فخر عالم کے بستر میں مس سینہ سو رہی تھیں۔ جنہیں چاقو سے پے دسپے وار کر کے ختم کر دیا گیا۔

”بیٹی۔ مسز فخر عالم کی بہن کو تو اسکے مگیتر نے قتل کیا ہے۔ اخبار میں پڑھا ہوگا تم نے...“

ایڈیٹر اشفاق کی آواز پر وہ بچی گی۔

”جی... جی... ہاں۔“ خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے اس نے سرکسی کی پشت سے لگا لیا۔ چند لمحوں کے بعد آگے بڑھتے ہوئے میز پر رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈال کر پینے لگی۔ شاید ایسے ہی حواس درست ہوں، کام کرنے لگیں۔

اس نے ہائی کے خط پر نظر ڈالی۔

تم ایک رپورٹر ہو بجائے فیسے کے تہاری یہ انا مجھے امی لگی۔ اسی لئے مجھے بھی یہ سب کرنے میں حرا آ رہا تھا، اچھا لگ رہا تھا سب۔

تہاری جرحوں میں امید بچا بھی جا رہی ہوگی۔

خدا حافظ۔

قال، مسٹر شرابی، دو مٹائیزں جو بھی سمجھو!

جانے ہائی کا وقت اس نے آپس میں کیو کر گزرا؟

پکارتے ذہن، کھوتے سر اور ڈانگائے قدموں سے وہ فلیٹ پر پہنچی تو اپنا بیٹھ بیگ ایک

طرز اچھا ہے بستر پر ادھی پڑی۔

آگے کھلی تو شام کے سامنے کھبے ہوئے تھے۔ موسم خوشگوار تھا اور سٹریٹ پر کے لیمپ روشن ہو چکے تھے۔

فرزانہ چائے بنا کر بیٹھی اسی کی بستر تھی۔ وہ اٹھی جلدی سے ہاتھ روم گئی۔ منہ دھویا اور واپس آ کر فرزانہ کے سامنے وہ بالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

فرزانہ نے اسکے کپ میں چائے ڈالی۔

”جب سے آئی ہو کچھ کھوئی کھوئی سی لگ رہی ہو کیا بات ہے۔“ فرزانہ اپنی چائے میں کھج چلاتے ہوئے اسکے چہرے کو بغور دیکھتی ہوئی۔

”آں۔ نہیں تو۔“ وہ گریزا ہی مٹی۔

وہ واقعی اپنے حواسوں میں نہ تھی۔ وہاں کا قیام قدم قدم پر فخر عالم کی جاسوسی۔ اسکو فوراً ہی اس کے رپورٹر ہونے کا علم ہو جاتا۔ دوست کیلئے فون نمبر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسکے نوٹس پڑھ لینا جو اس نے ایڈیٹر کو لکھے تھے۔ پھر جب وہ فون کرنے لگی تھی وہ بیڑے خوشگوار موڈ میں ملا تھا، مطلب اس کو سب پتہ تھا۔ پھر تمام وقت وہیں بیٹھے رہتا کہ وہ فون پر کچھ کہہ نہ سکے۔ رات کو اسے درخت پر چڑھنے اور بالکنی میں اترتے وقت اسکا فوراً اپنے دوست سے ساز باز کرنا، گلاس میں ڈرنک لینا، اپنی بہن کے قتل کا ذکر کرنا، بند فون پر سنگٹنگ کی باتیں کرنا، فرضی سہلی کا انتظار کرنا۔ اور۔۔۔

دھنک سمجھتی رہی کہ اس نے میدان مار لیا۔

پھر۔۔۔ وہ پراسرار قسم کے کارڈز۔ انکی عجیب سی اسے گھورتی نظریں۔

دو دفعہ اسکے کمرے میں سے فخر عالم کی مخصوص پرنیوم کی مہک آتا۔ تب بھی وہ سمجھ نہ سکی کہ معاملہ کیا تھا؟ ایک بار وہ کمرے میں فون نمبر ڈھونڈتے اسکا ایڈیٹر کے نام ادھورا خط پڑھ گیا تھا۔ دوسری بار وہ کیسٹ لینے آیا تھا جس میں انکی بظاہر ڈرنک ہو کر باتیں کرنے کا تمام ثبوت تھا۔

’By the way Miss! تمہارا یہاں نزول کیسے ہوا؟ کہاں سے آئیں؟ کس

سلسلے میں آئیں؟‘ وہ مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ بلکہ۔۔۔

اب سوچتی تھی تو انکی مسکراہٹ میں ایک قانع کی سی شان تھی۔

’بڑی جلدی خیال آیا۔ اس نے کہا تھا۔‘

’پلو دیر سے کی بتا تو وہ۔ کیوں آئی تھیں؟ کیسے آئی تھیں؟ انکی آنکھوں میں شونج چمک

تھی۔‘

READING SYSTEM

گویا اسے سب خبر تھی۔ پھر بھی اسکے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

’آپ تو یوں سب پوچھ رہے ہیں جیسے کوئی پریس رپورٹر کسی کا انٹرویو کر رہا ہو۔‘

وہ پریس سے تعلق رکھتی تھی۔ رپورٹر تھی۔ زبان پر بات آتی گئی۔

اسکا جائداد قبضہ اس وقت بھی اسکے کانوں میں گونجا۔

وہ جانتا تھا وہ رپورٹر تھی، جیسی تو دوسروں کی سیدھی بات میں بھی رپورٹنگ کا پہلو نظر آتا

تھا۔

’نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ پریس رپورٹرز سے تو میں خود الگ ہوں۔‘

’اوہ۔ وہ دیر سے مسکرائی تھی۔ دل میں سوچا تھا اسے کیا خبر رپورٹر اسکے سامنے

گھڑی تھی۔

’کچھ تو ہے۔‘

وہ فرزانہ کی بات پر چوگی۔

’دراصل گھر گئی۔ بڑے مزے کے چند دن گزارے مگر آخری دن پاس پڑوس میں کسی

کا ایک بیڈنٹ ہو گیا۔ دو بندے ختم ہو گئے۔ بس وہی سب ذہن میں بسا ہوا ہے۔‘ اس نے

بات بتائی۔

’پلو بس اب اور نہ سوچو۔ یہی ہے جس کو زندگی کہتے ہیں۔ انسان بے بس ہے کر بھی

کیا سکتا ہے۔‘ فرزانہ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

’دراصل دھنک کنفیوزڈ تھی۔ سب الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ وہ کتنے طعمرات سے گئی تھی اور

تھا کیا؟

اسکے دل میں اس شخص کیلئے بے پناہ نفرت تھی۔ اسکے کروت اسے پاگل کہنے دیتے

تھے۔ اسکی ٹھاٹھ بات، آن ہان بہان شوکت سے اسے آگ لگتی تھی مگر۔

وہ تو ایسا نہیں تھا۔ بلکہ اسکے برعکس تھا!

بہر حال اس نے چائے پی۔ پھر فرزانہ کے ساتھ چند ضروری چیزیں خریدنے بازار چلی گئی۔

پلوں کی پائیلیس بجتی رہیں، دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں ڈھلتے گئے۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ وہی صبح رسالے کے دفتر جانا، گا ہے گا ہے اور ہر ادھر سے

رسالے کے لئے کچھ مواد جمع کرنا یہی گاؤں کی عورتوں کے مسائل پر، کبھی نوجوانوں کی بے

روزگاری پر، اور آجکل تو وہ خانہ بدوشوں کے خیموں میں جا جا کر بیٹھتی تھی ان پر فوج لکھنے کیلئے

۔ دوپہر دیر سے فارغ ہو کر فلیٹ پر آتی۔ مگر۔

اسکے روٹین میں ایک غیر محسوس سی تبدیلی آگئی تھی۔ دوپہر یا رات کو آرام کی غرض سے

بستر پر لیٹی تو چونک چونک اٹھتی۔ لہجے اونچے پائیز میں الجھے سفید بادل، ماکٹر کھر میں ڈوبا

گھڑی کا چھوٹا ساہل، اس پر کھبے میں لگی راستے کی نشاندہی کرتی فونگ لائٹ۔ گھڑی

گھڑی بارش، دھند، ٹھنڈ۔

اور۔ اور۔ کچھ اور بھی۔ ایک بے حد پینڈسم، ڈشنگ ہیولا۔ اور۔

اس سے آگے وہ سر جھٹک دیتی۔ کہ وہ اتنا خوبصورت خواب دیکھنے کی قائل نہ تھی۔

سردی سے گرمی، اور اب ایک بار پھر رات بدل رہی تھی، راتیں بچ بست اور دن چھوٹے

ہو گئے تھے۔ گلابی جاڑے ہمیشہ اسکے حواس تک میں اتر جاتے تھے۔ سردیوں میں وہ ایک

نا معلوم سی خوشی محسوس کرتی تھی۔

سفید شلوار، مسٹر ڈکٹر پر عذ قلمیض اور مسٹر ڈو پنے کیساتھ ہر رنگ شوز پہنے وہ بس شاپ

پر گھڑی بس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

آج پھر امی کا خط آیا تھا۔ ایک بار پھر اصرار کیا تھا۔ وہی اسکی شادی کے سلسلے میں اچھ

ماہ قبل بھی اسی رشتے کی امی نے بہت تعریف لکھی تھی مگر وہ صاف مگر گئی تھی۔ اب بقول امی وہ

میں۔ پھر ایسے میں ایک سائے کے پیچھے بھاگنا۔ اپنے دن راتوں کا سکہ چین گنونا۔ مگر کیا یہ سب اسکے بس میں تھا؟

لوگ ایک دفعہ پھر آئے تھے۔ پھر اصرار کر رہے تھے۔ مگر۔۔۔
جانے کیا بات تھی؟ اسکا دل مانتا ہی نہیں تھا۔ وجہ کیا تھی؟ شاید رسالے کی رپورٹنگ بذات خود بلکہ صحافت بذات خود ایک بہت دلچسپ چیز تھی اور وہ اس سے وابستہ رہنا چاہتی تھی۔ پھر وہ سوچتی کیا اتنا ہی تھا؟ مگر۔۔۔

جب ایمانداری سے دل ٹٹولتی تو یہ بات دوسرے درجے پر نظر آتی۔ کچھ اور تھا جو شادی میں مانع آ رہا تھا۔ سال بھر قبل واقعی وہ صحافت کو اولین درجہ دیتی تھی مگر اب۔۔۔
اب جیسے کوئی اور بات تھی!

معاں نے دیکھا سامنے سے ایک گاڑی آرہی تھی۔ ڈرائیور گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور پچھلی سیٹ پر فخر عالم بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی ایک لڑکی بھی۔
پہلے تو اسکے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہوئیں، آنکھوں میں قدیلیں سی جل اٹھیں۔
مگر۔۔۔

دوسرے ہی لمحے کھلے ہوئے چہرے پر یاسیت چھا گئی، آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ شاید فخر عالم کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی مگر اس کیساتھ کسی لڑکی کو دیکھ کر وہ مایوس ہو گئی تھی۔
بہر حال۔۔۔ اس نے رخ دوسری طرف کر لیا۔ جیسے اس نے دیکھا ہی نہ ہو۔ گاڑی گزر گئی اور وہ اسکی دھول کو بکھتی رہ گئی۔

بس میں بیٹھنے لگی تو پاؤں جیسے من من کے بھاری محسوس ہوئے اور۔۔۔ وہ دل سے یہ سوال کئے مانتا نہ ہوگی۔ کیا وہ فخر عالم کو چاہنے لگی تھی؟

دن سونے سونے راتیں بے کیف کتنے لگیں۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ ایک سائے کیلئے بے قرار رہنے لگی تھی۔ اس کیساتھ بٹھی لڑکی کو خود اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا پھر بھی دل تھا کہ بے قابو ہو رہا تھا۔

وہ اپنے دل کو بہت سمجھاتی۔ کہاں وہ مخلوقی میں رہنے والا۔ کہاں دھنک، ایک لٹل کلاس لڑکی اور پھر فخر عالم کیساتھ وہ لڑکی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ دونوں کی انڈر سٹینڈنگ تھی آپس

سو ساری ساری
ڈاکٹ
کام

مکروہ چلتی گئی کہ اسے کچھ عادت سی ہو چلی تھی۔ بارشوں کی، بادلوں کی اور بے حساب ٹھنڈکی۔

معا ایک جیب پاس آ کر رکی۔
"آؤ۔"

اس نے دیکھا فخر عالم تھا۔ ڈرائیو بگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہاتھ اسے سہارا دینے کو آگے بڑھایا تھا۔

بغیر کچھ سوچے سمجھے جیسے کوئی مقناطیسی کشش تھی جو اسے کشاں کشاں جیب تک لے گئی۔ فخر عالم کا آگے بڑھنا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جیب آگے بڑھنے لگی۔

"دستہیں چھتری لے کر نکلتا چاہیے تھا۔ یہاں کی بارش کا کچھ پتہ نہیں چلتا کب شروع ہو۔" وہ سڑک پر نظریں جمائے تھا۔

وہ خاموش رہی، کہتی بھی کیا۔

اس وقت تو بس دل تھا کہ زور زور سے دھڑکے جا رہا تھا۔ وہ اس شخصیت کے نزدیک بیٹھی تھی جسے وہ من ہی من میں کتنے عرصے چاہتی آرہی تھی۔ فخر عالم بھی اسکی کیفیت سے آگاہ تھا یا نہیں یہ اس نے ضروری ہی نہیں سمجھا۔

"مادام جرنلسٹ۔ کیسے حال چال ہیں۔" اب بھی وہ ہی خوشگواہی سے بولا۔
"ٹھیک ہوں۔"

کچھ ٹاپے وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

"کبھی مجھے بھی یاد کیا تھا اتنے عرصے میں۔" وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ دھنک اسکے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکی۔

"نہیں تو۔" اس نے خالص جھوٹ بولا۔

"کر لیا ہوتا تو کیا چلا جاتا تمہارا۔ مجھے تو تم اکثر یاد آتی رہیں۔" رخ پھیر کر اس نے

سردیاں گزر گئیں، گرمیاں آئیں اور خوب زور شور سے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے لگتا تھا پگھل جائیگا بندہ۔

ایسے میں اچانک ای کا فون آ گیا۔

"چھ دن کی چھٹی لے کر یہاڑ پر پہنچ جاؤ، ہم لوگ آج ہی جا رہے ہیں۔"

خوشی تو اسے ہر بار ہوتی تھی بل شیٹن پر جانے کی مگر۔ اس بار خوشی کچھ نرالی تھی، انوکھی تھی!

اس نے فوراً ہی چھٹی کی درخواست دے ڈالی۔ جو منظور ہو گئی۔

اور وہی دن بعد وہ اپنے ای ابو اور بہنوں تسلیم اور نعلیم کیساتھ تھی۔ ان سب کو پا کر

اسے تعویذ کا احساس ہوا کہ دل۔ جواب اسکا نہیں رہا تھا اپنوں کو پا کر اپنے وجود کا احساس

تو ہونے لگا تھا۔ دوش ہاں تو وہ ایک خالی خول کی مانند تھی۔ خالی خالی نظریں، بھٹی بھٹی سی روح!

شام کو اسکی آنکھ کھلی تو پانچ بج رہے تھے۔ قیٹ میں کوئی نہیں تھا۔ شاید واک کرنے یا

پارک میں نکل گئے تھے۔

انھ کس نے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ کپڑے بدلے، بال درست کئے۔

اور۔ اپنے پسندیدہ چھوٹے سے لکڑی کے کھوکھو والے ہوٹل میں چائے پینے باہر نکل آئی۔

آسمان پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے، نیچے کھائی میں اتنی کہ تھی کہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، سردی

اتنی تھی کہ ایک سوٹ ناکانی ہو رہا تھا۔

بہر حال وہ آگے بڑھنے لگی۔ چکر دار سڑک کی گولائیوں پر چلتی چلی گئی۔

اچانک ٹپ ٹپ موٹی موٹی بوئیں پڑنے لگیں۔

"No, I mean it. You are going to be the very first reporter to have my interview."

"اتنے مہربان کب سے ہو گئے۔"

"جب سے تمہیں دیکھا تھا..."

وہ لڑکی۔ اسے پھر خیال آیا۔ فلٹ تھا یہ یونانی دیوتا!

جیب دریا پر سے ہل کو کراس کرتی اسکے علاقے میں داخل ہو گئی۔ وہی جنگل تھا پھلے

سال ڈیڑھ سال والا۔ اسی میں میزھا میٹر ہزار ستہ تھا جس پر جیب آگے بڑھ رہی تھی۔

وہی لکڑی کا مکان تھا، وہی اسکے آگے چھوٹا سا لکڑی کا ہل، وہی گھر کے پیچھے والی

مصنوعی جھیل میں سے آکر ہل کے آگے آبشار کی صورت میں گرتا پانی۔ لکڑی کا جھونپڑا نما مکان

اب بھی درختوں اور سبزے میں گھرا تھا، اوپر کی بالکنیوں میں سے اب بھی ان گت سرخ پھول

جھول رہے تھے، مکان کی ڈھلانی چھت آج بھی سرخ پھولوں سے ڈھکی تھی اور۔ قدم

قدم پر خود رو ڈیزیز اس وقت بھی سر اٹھائے نرم خرام ہوا میں جھوم رہے تھے۔

جیب آگے چل کر بائیں جانب پورچ میں رک گئی۔ کئی ملازم اب تک چوکنے ہو گئے تھے۔

فخر عالم کیساتھ ساتھ انہوں نے دھنک کیلئے بھی دروازہ کھولا۔ ان کے چہرے جانے پہچانے

تھے۔ اسے دیکھ کر خوش لگ رہے تھے۔ جیسے اچھا لگا ہوا نہیں اس کا آنا!

فخر عالم اسے اسی ہال میں لے گیا جہاں قریباً ڈیڑھ سال قبل وہ فون کرنے آئی تھی۔

پھر اس سے ملحقہ قدرے جھونے لاؤنج میں۔ یہاں گداز قالین پر قیمتی صوفے لگے تھے۔

ہر طرف کھڑکیاں تھیں۔ پردے ہٹائے گئے تھے اور باہر بادل میں لپٹے پائیز چپ چاپ

کھڑے موسم لادھار بارش کے تھپڑے سہ رہے تھے۔

"تم بیٹھو۔ میں پیچ کر کے آتا ہوں۔"

وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا چلا گیا۔

اور دھنک چوڑی کھڑکی کے پاس لگے صوفے پر بیٹھی سامنے کے نظاروں پر نظر میں جمائے

دھنک کو دیکھا۔
تو سب طرح کے تمام رنگ دھنک کے چہرے پر چھانگے۔ سیاہ جھالیں پلکیں جھک گئیں۔

نازک ہاتھ کا پ سے گئے۔

"کیوں؟" اس نے ہمت مجتمع کی۔ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اس کیوں؟" کا مجھے خود بھی اب تک پتہ نہ چل سکا۔

معاذ دھنک کو خیال آیا اس کیساتھ اس لڑکی کا مگر۔ ذکر نہ کیا۔ بات دل ہی میں رہنے دی۔

اس نے دیکھا چھوٹا سا بازار نیچے رہ گیا تھا اور وہ اوپر ہی اوپر بڑھ رہا تھا۔

"میں نے تو بازار میں اترنا تھا۔" وہ بول پڑی۔

"کیا کام ہے بازار میں؟" اطمینان سے کہتا وہ چلا ہی گیا۔

"پلیز؟"

"یاد آ گیا کام ہے بازار میں۔"

"چائے چینی تھی۔"

"اوہ۔" وہ خوبصورتی سے مسکرایا۔ "چائے نہیں۔ کوئی پیسے گے۔ دونوں مل کر۔"

میرے گھر میں۔"

"پلیز! اچھا نہیں لگتا۔ آپکے ملازم وغیرہ کیا سوچیں گے۔"

وہ زور سے ہنس دیا۔

"اور وہ پہلے جو آئی تھیں۔"

"وہ تو... وہ تو میرے پروفیشن کا تقاضا تھا۔" وہ بھی ہنس دی۔

"انہیں تو تب بھی معلوم نہیں تھا کہ تم اپنے پروفیشن سے آئی ہو۔"

"پتہ نہیں کیوں اب کے بغیر کسی مقصد کے جانا... لگتی سا محسوس کرتی ہوں۔"

"یہاں کہہ۔ تم میرا ٹرو پولو۔"

لہذا چاہتے ہوئے بھی دھنک کلکسلا کر ہنس دی۔

فخر عالم کا رنگ بدل سا گیا۔ چہرے پر ناگوار سے تاثرات ابھرے۔
 ”ہاں“۔ اس نے اتنا ہی کہا۔ پھر سامنے کے پائیز پر نظریں جمادیں۔
 تجھی پیرا دونوں کیلئے کوئی لا کر درمیان والی میز پر رکھ گیا۔ ساتھ میں چیز سینڈویچز اور
 ہنٹر بیف۔

فخر عالم نے دھتک کیلئے کوئی بنا کی۔ دودھ اور چینی ملا کر اسکے آگے کھسکایا۔ اور اپنے
 لئے صرف کوئی ڈال کر اوپر سے ابلا پانی انڈیلا اور چھچھلا کر۔ تلخ گھونٹ حلق سے
 اتارنے لگا۔

دونوں خاموشی سے اپنی اپنی کوئی پینے میں مصروف تھے۔
 دیکھتے ہی دیکھتے بارش ختم گئی۔ درخت دھلے دھلے لگنے لگے اور۔ مطلع صاف
 ہونے لگا۔

”یہ اونچے اونچے درخت بارش میں دھل کر کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔“
 ”مجھے تو وہ۔ سامنے والی رین بوا چھی لگ رہی ہے مس رین بوا۔ اس نے بڑی سی
 جگہ پر محیط رنگ برنگے رین بوکی طرف اشارہ کیا۔
 وہ مسکرا دی۔ دھیرے سے۔

”مگر اس رین بو سے یہ والی رین بوا زیادہ پیاری ہے کیوں؟“ اندر رخ کرتے ہوئے
 اس نے دھتک سے کہا۔
 وہ مزید مسکرا دی۔

”تمہارے دانت بہت خوبصورت ہیں۔“ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔
 دھتک چپ سی نظر آنے لگی۔ پورا ڈیڑھ سال تو جانے کہاں کہاں قمرٹ کرتا رہا۔ آج
 وہ نظر آگئی تو اسے بنانے لگا۔

”مجھے مزہ دیکھے کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔“ دھتک نے اب بھی مسکراتے ہوئے کہا۔
 فخر عالم نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اسکے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس کے متعلق سوچنے لگی۔
 وہ کیوں اسے یہاں لایا تھا؟
 ”مجھے تو تم اکٹریا داتی رہیں۔“
 ”کیوں؟“

”اس کیوں؟“ کا مجھے خود بھی اب تک پتہ نہ چل سکا۔
 اسکی باتوں میں اشارہ تھا۔ اس کیلئے پسندیدگی کا مگر۔
 صرف پسندیدگی سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو اسے چاہتی تھی بے تحاشہ
 دہنٹا وہ اندر آ گیا۔

لاہیٹ گئے شلو اور لمبیں اوپر سے اسی رنگ کا نرم اور قیمتی سوئٹر۔ پاؤں میں جہل۔ جیسے
 ریلیکس ہونا چاہتا تھا۔

قریب آ کر وہ اس کے مقابل والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ”تم خاصی بلیک گئی ہو۔“ وہ تشویش سے بولا۔ پھر مسکرایا۔ ”میرے کپڑے پہنو گی؟“ وہ
 جیسے یوں ہی کہہ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ ایسا نہیں کرے گی۔

”نہیں۔“ وہ بھی مسکرا دی۔ ”میں اتنی نازک نہیں کہ بارش میں بھینکنے سے بیمار پڑ جاؤں۔“
 ”اوہ۔“ وہ جیسے دل ہی دل میں اس پر ہنسا۔ نازک تو وہ خاصی تھی، ہاں بولڈ ضرور تھی۔
 ”آپ... آ کہاں سے رہے تھے؟“ دھتک نے یوں ہی پوچھ لیا۔
 ”شہر سے۔ گری تھی وہاں۔ مگر پرسوں واپس جاؤں گا چند دن کیلئے۔“

شاید اس لڑکی کیلئے دھتک نے سوچا۔
 ”میں نے آپکا ایک بار دیکھا تھا گاڑی میں گزرتے ہوئے۔“
 ”کہاں؟“

”وہیں شہر میں ایک لڑکی بھی تھی آپکے ساتھ۔“ باوجود کوشش کے اسکے لہجے میں شکوہ
 سا لہرا آیا اور۔

”یہ منہ دیکھے کی باتیں نہیں ہیں۔ تم مجھے اکثر یاد آئیں۔ یقین نہ ہو تو میری ڈائری میں اپنا لیڈر لیس دیکھ لو۔ تمہارے گھر کا ایڈریس۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے فادر انگلش ڈیپارٹمنٹ کے چیئر مین ہیں۔ تمہاری دو بہنیں اور ہیں۔ ان کے نام تک مجھے پتہ ہیں... لیکن — وہ حیران ہی اسے دیکھ رہی تھی۔

”لیکن کیا؟“

”میری کچھ مجبوریاں تھیں، بلکہ ہیں۔ جن کی وجہ سے میں تمہیں مل نہیں پایا۔“

”اور آج؟“ وہ اب بھی حیرت زدہ تھی۔

”آج تو خدا نے سن لی۔ تمہیں خود بخود لاڈالا میرے پاس۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

اور دھنک باقی کی کوئی پیٹے ہوتے اسکی باتوں پر غور کرنے لگی۔

”تم یہاں کتنے دن رہو گی؟“ فخر عالم نے خالی گک میز رکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہی آٹھ دس دن۔“

”اوہ۔ پھر تو میں شہر سے جلدی واپس آؤنگا۔“ وہ مسکرایا۔

”کیوں؟“

وہ ویشی آنکھوں سے اسکی آنکھوں میں جھانکا۔

”اسلئے کہ یہاں تم ہو۔ اسلئے کہ یہاں میں تمہیں ملتا رہوں گا اور — اور اسلئے کہ میں تم

سے پیار کرتا ہوں... کچھ اور پوچھتا ہے؟“

وہ اب بھی اسکے جھکے سر ہر رخ چہرے اور کانپتی لرزتی پلکوں کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ... وہ لڑکی کون تھی؟“ کانٹا تو اسکے دل میں چبھایا تھا۔

”انہو — بھول کیوں نہیں جاتی ہو اس لڑکی کو۔“

”کیسے بھول جاؤں؟“ وہ پھولے پھولے منہ کیساتھ بولی۔

”جیسے میں بھول گیا ہوں۔“

دھنک کو ایک گونہ تسلی ہوئی۔

”کون تھی وہ؟“ وہ شاید اپنی حریر تسلی کی خاطر بولی۔

”تھی بس کوئی۔ اور اسکا وہ تم اسکا ذکر نہیں کرو گی۔“

اس نے بات ہی ختم کر دی۔ اسے بھی اور زیادہ کریدنا اچھا نہ لگا۔ ٹھیک تھا جو بھی تھی

اسکی۔ اب تو نہیں تھی۔

وہ مطمئن سی نظر آنے لگی۔

تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

”اب پلیز مجھے چھوڑ آئیں۔“ کوئی کا خالی گک اس نے میز پر رکھ دیا۔

”چھوڑ آؤنگا ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“

”اندھیرا ہو چکا ہے...“ وہ کھڑکی میں سے چھوٹے چھوٹے گھروں کی ٹوٹتی ہوئی چیموں

کو جھگ جھگ کرتے دیکھتے ہوئے بولی۔

فخر عالم نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کر دی۔

”کہاں ہے اندھیرا؟“

”مذاق نہیں۔ پلیز! وہ دیکھیں سارا گاؤں بتیاں جلا چکا ہے۔“ وہ کچھ ان ایزی سی لگ

رہی تھی۔

”تم دہی ہو جو راتوں کو درختوں پر چڑھتی تھیں...“

وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

”اب شاید میں بزدل ہو گئی ہوں۔“

”پیار میں ایسا ہوتا ہی ہے۔“

”کافی تجربے کا رنگتے ہیں آپ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تھوڑا تھوڑا — کبھی کبھار...“

اور وہ ہل پڑی۔

فخر عالم نے جھٹ سے اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔

HEADING
System

”یارتان بھی نہیں سمجھتی ہو کیا چیز ہو۔“

”یہ مذاق نہیں ہے۔“

”اچھا نہیں ہے۔ اس کی شکل مسکین ہو گئی۔“

”آئندہ میں نے کسی لڑکی کو آپ کیساتھ دیکھانا تو۔۔۔“

”تو۔ کیا کرو گی؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”مارو گی میں۔“

”کس طرح؟“

”اس طرح۔“ کوہنہ ہاتھ چمڑا کر اس نے ہلکا سا مکا اسکے مضبوط سینے پر دے مارا۔

اسکا ہزک سا دارا سے اچھا لگا، محلوظ ہوا، اٹھ کھڑا ہو۔

”چلو ہم۔ تمہیں چھوڑ آئیں۔“

دونوں لاؤنج سے باہر آ گئے۔

اسے ٹھنڈ لگ ہی گئی۔ دودن خاصا بخار رہا۔ آج کچھ بہتر تھی۔ دوپہر کو جو سو کر اٹھی تو شام

کے سائے نیالے ہو رہے تھے۔ اٹھ کر اس نے ہاتھ روم میں منہ پر پانی کے مچھینے دیئے۔

گرے پر عذ گرم کپڑے پہنے۔ گرے لیدر کے شوز اور گرے ہی جیکٹ پہنی۔ اپنی پسندیدہ

پرفیوم لگاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

دیکھا کوئی نہیں تھا سوائے ابو کے جو برآمدے میں کرسی پر بیٹھے اطراف کے نظاروں

سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”ابو سب لوگ کہاں ہیں؟“ اس نے ابو سے پوچھا۔

”بیٹے نیچے گئے ہیں کھونے۔ تمہیں اسلئے نہیں جگایا کہ خواہ مخواہ ڈسٹرب ہو گی۔“

”ابو میں بھی جاتی ہوں نیچے۔ اُنکا تلیٹ کافی اونچائی پر تھا۔“

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گنے پنے مکان اور ضروری اشیاء کی چند دکانوں پر

مشتمل۔ یہاں کسی کے گم ہونے یا پھرا کیلے جانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ نیچے جاتی تو امی

اور تسلیم اور سلیم سبھی کہیں نہ کہیں نظر آتی جاتیں۔ یاد رکھ کر رہی ہو گی یا چھوٹے سے پارک

میں جمبولوں ہی سا وغیرہ میں مصروف ہو گی یا پھر سب کی پسندیدہ چائے سوسے اور پکوزوں کے

چھوٹے سے لکڑی کے کھوکھے میں لکڑی کی شیخ پر بیٹھیں سوسے یا پکوزے کھا رہی ہو گی۔

اسکا بھی دل چاہا۔ اسی کھوکھے سے چائے پینے کو۔ ٹائیو سٹار ہوٹلو کی بیالی بھاری اور

چائے ہلکی ہوتی ہے۔ مگر ان کھوکھوں کی بیالی ہلکی سی چائے زبردست ہوتی ہے۔

جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے وہ سوچوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ ابھی اوپر ہی تھی کہ

چونک پڑی۔ نیچے سڑک پر فخر عالم اپنی جیب میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ تو وہ تھی وہ جلد

لوٹ آیا تھا۔

اسے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا، انوکھی طہانیت کا

بازار پہنچ کر وہ اپنی پسندیدہ دکان میں بیچ پر بیٹھ گئی۔ دکاندار نے لکڑی کی میٹلی سی میز
میلے سے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے اس پر اسکے سامنے چائے رکھی۔ وہ چھوٹے سے
بازار میں شام کی پہل سے محفوظ ہوتی گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پی رہی تھی۔

تجبی۔ وہاں فخر عالم آ گیا۔ گرے کلر پینٹ پر اسی کے امرنگ فر کی لائینگ والا ہاف
لینتہ قیمتی رین کوٹ پہنے وہ ہمیشہ کی طرح شاندار لگ رہا تھا۔

”صاحب آپ کیسے ہم غریبوں کی دکان پر آ گئے۔“ بوڑھے دکاندار کا چہرہ خوشی سے
چمک رہا تھا۔

”نہیں بابا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے کام سے وقت نہیں ملتا۔“ وہ دکاندار کی
عمر کی وجہ سے مؤدب طریق سے بولا۔

”کیا لاؤں سرکار؟“

”چائے۔“

دکاندار چائے بنانے لگا۔

”اور تم صاحب تم یہاں کیا کر رہی ہو۔“ وہ اس کے مقابل بیچ پر بیٹھ گیا۔

”چائے پی رہی ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ تمہیں ہی یہاں دیکھ کر تو میں آیا ہوں۔ وہ اوپر۔“ اس نے
اشارے سے دکھایا۔ ”سڑک سے گزر رہا تھا تو نیچے تم نظر آ گئیں۔ گھر پہنچے ہی واپس چلا آیا۔

مگر تم۔“ چائے یہاں کیوں جیتی ہو۔“ اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ بازار کے بیچ بیٹھ کر چائے
پینا۔ چند دکانیں وہ بھی جانی پہچانی۔

وہ مسکرائی۔

”روز تو نہیں جیتی۔ کبھی کبھار آ جاتی ہوں۔ اچھا لگتا ہے مجھے۔ اور پھر ہم ٹور سنس کو یہاں

کون جانتا ہے...“

اسکی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے فخر عالم نے گہری سانس لی۔ پھر وہ بھی مسکرا دیا۔

اسکی چائے آ گئی۔ بڑے بڑے گھونٹ لے کر فوراً ہی پیالی خالی کر دی۔

”آؤ۔“ اٹھتے ہوئے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

دھنک نے اسکا ہاتھ تمام لیا مگر۔

”کہاں؟“

”بازار سے باہر نکل کر گھومیں گے۔“

اور دھنک نے اچانک امی، تسلیم اور نسیم کو وہاں سے گزرتے دیکھا۔ جلدی سے ہاتھ
اسکے ہاتھ سے نکال لیا۔

”امی ہیں۔ بہنیں ہیں میری۔ اچھا میں جلتی ہوں۔“ وہ کچھ سٹ پٹائی سی لگ رہی تھی۔

دھنک نے فخر عالم کے منع کرنے کے باوجود دونوں کی چائے کی پے منٹ کی۔

”خدا حافظ۔“ اس نے کہا۔

اور دکان سے باہر نکل کر ان لوگوں سے جا ملی۔

فخر عالم۔ دیکھتا ہی رہ گیا۔

اور وہ شورٹ کٹ سے ہوتی اسی جگہ آگئی جہاں قریباً بیس سال قبل اس نے سیکھا اور یہ
پار کیا تھا۔ بڑے بڑے پتھر اب بھی موجود تھے۔ کئے ہوئے درختوں کے سبب بھی پتلی
کے بہاؤ پر وہاں دوواں تھے۔

وہ احتیاط سے پتھروں پر قدم چھاتی دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔

فخر عالم وہیں کھڑا تھا۔ اونچا قد، چوڑے شانے، گندمی صحت مند رنگ، پرکشش
نقوش، گھنی سیاہ مینوٹیس، سیاہ چمکتی آنکھیں۔ سیاہ قیمتی سوٹ زرب تن کے مشابہت انداز!
اسے وہ کسی دیومالائی کہانی کا شہزادہ لگا۔

"Happy birth day sir." اس نے مسکراتے ہوئے فخر عالم کی طرف

پھولوں کا خوبصورت گلہستہ بڑھایا۔

"تھینک یو میم۔" فخر عالم نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

ایک ہاتھ سے اس نے Bouquet پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اسکا نازک ہاتھ

تھام لیا۔

"یاد ہے کچھ عرصہ پہلے یہاں کیسے آکر لڑھکی تھیں۔" اس مخصوص جگہ سے گزرتے

ہوئے فخر عالم نے مسکراتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"مگر آج تو میں لیگل طور پر آئی ہوں چوری سے نہیں۔"

"لیگل آ جاؤ تا دھنک پلیز؟" اس نے اس کے ہاتھ میں تھامے ہاتھ پر اپنے پرکشش لب

رکھ دیئے۔

دھنک کے رگ و پے میں سنسائٹ سی دوڑ گئی۔

سیاہ خمیدہ پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

اسکا یہ روپ فخر عالم کو مسحور کر گیا۔

اسکا ہاتھ تھامے تھامے وہ اسے گھر کے اندر لے گیا۔

آج بھی بڑے بڑے ہال میں قیمتی کرشل کے بڑے بڑے فالوس ہال کو خوبصورت بنا

دن کے کون سا بج رہے تھے۔ وہ اپنے گھر کے چھوٹے سے برآمدے میں بیٹھی مدھوپے
لطف اندوز ہوتی آج کا تازہ اخبار پڑھ رہی تھی۔

تجبی اس نے دیکھا۔ نیچے ایک کار آ کر رک گئی۔ اس میں سے برآمد ہوتا ڈرائیور اگی

پگڈنڈی پر چلنا ہو پڑا آیا۔ نہایت ادب سے اسے ایک بڑا سا سفید لٹافہ تھمایا۔

"میڈم۔ یہ مسٹر فخر عالم نے آپ کے لئے دیا ہے۔"

وہ شاید اسے جانتا تھا۔ مگر دھنک نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ واپس چل دیا۔

دھنک نے لٹافہ کھولا۔ Invitation تھی فخر عالم کی برتھ ڈے کی۔ اور جسے بقول

فخر عالم صرف وہ دونوں منانے جا رہے تھے۔

شام ٹھیک چار بجے وہ تیار ہوئی۔ ڈارک گرین کپڑوں میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

اپنے جی براؤن سٹریٹ خوبصورت بالوں میں برش کیا۔ کپڑوں کے ہمرنگ دوپٹہ، لیدر کے شوز

پہنے اور امی کے پاس کچن میں آگئی۔

"امی میں جاؤں دیر ہو رہی ہے۔"

اس نے صبح ہی اپنے کسی کوئیگ کی سالگرہ کا کہہ کر امی سے اجازت لے رکھی تھی۔ جانے

کیوں فخر عالم کا براہ راست نہ کہہ پائی تھی۔ گوامی نے یہاں بھی اعتراض نہیں کرنا تھا کہ اسکا

پروفیشن ہی ایسا تھا۔ مردوں سے بلا جھجک ملنا، بات چیت کرنا۔

"ہاں بیٹا۔ مگر جلدی واپس آنا۔"

"اچھا امی۔"

میں بھی اچھی ہی تھیں میرے ساتھ بس ڈانٹتی ذرا زیادہ تھیں۔ "وہ اداس سا مسکرایا۔" پھر میری ایک سوٹ سی بہن پیدا ہوئی۔ ہم دونوں کی عمروں میں تقریباً چار پانچ سال کا فرق تھا۔ سمینہ سوتیلی تھی پر کون کہہ سکتا تھا کہ ہم سوتیلی ہیں۔ بڑے پیار سے رہتے تھے ہم لوگ۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں بابا نے مجھے پڑھائی کیلئے سویٹزر لینڈ بھیج دیا۔ وہیں تھا میں جب ممی کے فوت ہونے کی خبر ملی۔ امتحان شروع تھے میں آنے لگا۔ میں ذہنی طور پر بہت ڈسٹر بڈ تھا۔ سمینہ کے دکھ کا میں اندازہ کر سکتا تھا۔ بہر حال میری پڑھائی جاری رہی۔ پھر۔۔۔ پڑھائی کے بس آخری دن تھے۔ Exam's شروع تھے۔ کہ بابا کے ڈیڑھ کی اطلاع ملی۔ آخری ہیپہ دیتے ہی میں پاکستان چلا آیا۔ سنا ہے انہیں زہر دیا تھا کسی نے۔ بہر حال۔۔۔ میرے آجانے سے سمینہ کو ڈھارس ہوئی۔ ہم دونوں بہن بھائی اپنا وقت کاٹ ہی رہے تھے کہ اچانک۔۔۔ میری

جگہ سے ختم کر دیا گیا۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا!"

اس نے گہری سانس لی۔ دکھ سے مسکرایا۔

"اپنے ساتھ تمہیں بھی پریشان کیا ہے۔" اسکی آواز میں گہری گھمبیر تھی۔ اداسی اور دکھ اسکی آنکھوں تک میں اتر آئے تھے۔

دھنک کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے کیسے تسلی دے۔

"آپ... آپ پریشان مت ہوں... پلیز!"

اور تھی۔۔۔ یہ ایک بہت بڑا فارمٹ ایک اٹھائے اندر آ گیا۔

مؤدب طریق سے دھنک کو سلام کیا۔ اب یہ سب لوگ اسات اچھی طرح جان گئے تھے۔

ایک میز پر رکھتے ہوئے دو بے قدموں والی چل دی۔

پھر لمبے روست، ہلکے ڈچکن روست، منمن تک، بیج کباب، پیپرو، چیز سینڈویچز وغیرہ

بھی آ گئے۔

صرف وہ دونوں تھے۔ لہر عالم نے موبم ہی چالی۔

آج وہ تیس سال کا ہو گیا تھا۔

رہے تھے، دیواروں پر لگی بیش قیمت پینٹنگز اپنے نکمیں کے ذوق کا پتہ دے رہی تھیں، بیش بہا مجسمے ہال کی زینت بڑھا رہے تھے اور۔۔۔ اوپر جاتی چوڑی کارپینڈ میٹھیوں کے پاس رکھا بڑا سا پیا نوال کی رونق میں اضافہ کر رہا تھا۔

دیوار پرانی قالین پر چلتے دونوں اسی دن والے بغل کے لاؤنج میں آ گئے۔ سالگرہ کے آچار کو کوئی نہ تھے۔ شاید وہ یوں ہی سادگی سے اپنی سالگرہ منایا کرتا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے مقابل چوڑی کھڑکی کے قریب صوفوں پر بیٹھ گئے۔

باہر ہمیشہ کی طرح فطرت اپنا حسن لٹا رہی تھی۔ قریب کے اونچے پہاڑ سر بللک درختوں میں ہادل دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ ہر طرف پہاڑ اور درخت! فخر عالم کا گھر جیسے سرسبز پالے کے پینڈے میں واقع تھا۔

"یہ والے درخت کس چیز کے ہیں؟" مسوری دھنک نے پائینز کے علاوہ بڑے بڑے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ خروٹ کے ہیں مگر۔" وہ مسکرایا "تمہیں کچے ہوئے خروٹ بمشکل نظر آتی ہے۔"

"کیوں؟"

"پکنے سے پہلے ہی بند رکھا جاتے ہیں۔"

اور دھنک خوب مسورتی سے ہنس دی۔

"تم سوچو گی میں اتنی سادگی سے اپنی برتھ ڈے مناتا ہوں۔"

"ہاں۔"

میں تو شاید مناتا ہی نہ مگر میرے بابا کہا کرتے تھے چاہے اکیلے ایک کانوگر برتھ ڈے

ضرور مناؤ۔۔۔ "وہ جیسے یادوں میں کچھ پیچھے چلا گیا تھا۔

"بابا کی برتھ ڈے بھی میں ہی منایا کرتا تھا۔ نہیں کبھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کب انکی برتھ

ڈے ہے۔ ای تو میں چھوٹا سا تھا جب ڈیڑھ ہو گئی تھی انکی۔ پھر بابا ہی میرے سب کچھ

تھیں کچھ عرصہ بعد انہوں نے دوسری شادی کی۔ مگر میری پرورش میں کوئی کسر اٹھانہ نہ گئی۔

"Now help me." اس نے ایک کاٹنے دقت کہا۔

اور دھنک اسکے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

دونوں نے اسٹھے ایک کاٹا۔ فخر عالم نے پیس پہلے دھنک کے منہ میں دیا باقی کا خود کھالیا۔

پھر انٹرکوم پر بیرے کو بلا یا۔ بیرا فوراً آ گیا۔

"یہ ایک تم لوگوں کیلئے ہے۔" فخر عالم بولا۔

اور بیرا سے Greet کرتے ہوئے ایک اٹھا کر چل دیا۔

وہ دونوں خوشگوار باتوں کے دوران مختلف چیزوں میں سے کھا رہے تھے۔

"چائے یا کوئی؟" فخر عالم نے پوچھا۔

"کوئی۔"

"گڈ۔ کوئی تو ٹیسٹ ہم دونوں کا ملتا جلتا ہے۔"

وہ مسکرا دی۔ ہونے لے۔

"تمہاری سائیل بہت Attractive ہے۔" اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ

مزید بولا۔

اور دھنک پھر دھنک کے رنگوں میں رنگ گئی۔ وہ مٹھوٹا ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

پھر کوئی آگئی۔ فخر عالم نے دھنک کیلئے کوئی میں دودھ اور چینی ملائی اور اپنے لئے

حسب عادت کوئی میں صرف کھولا ہوا پانی ملا دیا۔

دھنک مزے لے لے کے پینے لگی۔ جبکہ فخر عالم کڑوے ٹھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

"حلق جل جائیگا۔" دھنک مسکراتے ہوئے بولی۔

"حلق کا کیا ہے۔ میں تو سارے کا سارا جل رہا ہوں... کافی مرے سے۔" وہ اچانک

نجیدہ لگنے لگا۔

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔ کوئی اور بات کرو۔"

اسے کیا پریشانی تھی؟ دھنک سوچے بنا نہ رہ سکی۔

اس نے بھی مزید نہیں پوچھا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اسکا دھیان ہٹانے کو۔ اسے

خوش کرنے کو۔

پھر اس نے اجازت چاہی۔

باہر شام کے دھندلکے اتر آئے تھے۔ ڈھلانوں پر ادھر ادھر بکھرے چھوٹے چھوٹے

گھر وندوں میں روشنیاں جل اٹھی تھیں، جیسے بہت سارے سہرے موتی گر کر بکھر گئے ہوں۔

سر ہٹلک پائینز میں ہوا کی مخصوص سنسنات ہونے لگی تھی۔

"میں جاؤں اب۔ دیر ہو رہی ہے۔" دھنک نے کہا۔

"نہیں پلیز! اتنی جلدی نہیں۔ مجھے کیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔" اسکے لہجے میں التجا تھی۔

"لیکن جانا تو ہے نا۔" وہ مسکرا دی۔

"تھوڑی دیر اور۔" اس نے دھیرے سے اسکا ہاتھ اٹھایا۔ ہولے سے اپنے ہونٹ اس

پر رکھ دیئے۔

اور پھر جیسے اچانک کچھ یاد آیا۔

دلنشین آنکھوں میں شوخ چمک لہرائی۔ پرکشش لبوں پر شریر مسکراہٹ۔

"تم مجھے Kiss نہیں روگی۔ آج میری برتھ ڈے ہے۔"

اور جھمکتے جھمکتے دھنک نے اپنے یا تو تھی ہونٹ اسکے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"اوں ہوں۔ یہاں نہیں۔" اس نے اپنا گال قریب کر دیا۔ "یہاں۔"

اور دھنک نے وہاں بھی ہولے سے اپنے لب رکھ دیئے۔

فخر عالم مدہوش سا ہو گیا۔ آہستہ سے اسے اپنے سینے سے لگایا اور دھیرے دھیرے ڈھیر

سارا پیار کر لیا۔

"اب جاؤں۔" اسکی گرفت سے نکلنے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

وہ شرمیلی شرمیلی سی تھی۔ پلکیں اوپر اٹھ نہ پار ہی تھیں۔

وہ مٹھولا ہوتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔

"چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"صرف دریا کنارے تک۔"

"کیوں؟"

"آگے کہیں انی ابول گئے تو شامت آجائے گی۔"

"ٹھیک ہے آؤ۔" اس نے دھنک کا ہاتھ تھام لیا۔

دونوں باہر نکل آئے۔

ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اپنی دھن میں مست باتیں کرتے وہ چلے جا رہے

تھے۔

تجھی۔ ایک لمبی سی سفید گاڑی فخر عالم کے گھر کے میز سے میزے راستے پر آئی انہیں دیکھ کر رک گئی۔

فخر عالم نے آہستہ سے اسکا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"Just a minute." اس نے دھنک سے کہا۔

اور۔ گاڑی کی طرف بڑھا۔

یہ وہی لڑکی تھی۔ جسے ایک بار دھنک نے شہر میں فخر عالم کیساتھ گاڑی میں بیٹھے دیکھا

تھا اور جسکی سوچ اکثر اسکے ذہن میں سر ابھارتی۔

اسکا دل بیٹھ سا گیا۔

فخر عالم قریب پہنچا تو وہ گاڑی سے اتر آئی۔ بے اختیار بازو فخر عالم کی گردن میں جمائے

کر دیئے۔ بے تماشائے اسکے چہرے پر پیار کرنے لگی۔

"Happy birth day my love." وہ قدرے دم لینے کو رکھی تو اسے

Greet کیا۔

تھینکس۔ "فخر عالم مختصر ابولا۔ تم اندر جاؤ۔ میں انہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔" اسکا اشارہ دھنک کی طرف تھا۔

"Who is she supposed to be?" دو بڑی عمارت سے پوچھنے

لگی۔

"میرے بابا کے دوست کی بیٹی ہے۔" فخر عالم نے بات بنائی۔

"اچھا ڈارنگ جلدی آتا"

وہ گاڑی میں اندر کی طرف گئی۔ اور فخر عالم دھنک کی طرف۔

دھنک نے کوئی سوال نہ کیا۔ کہ سوال کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ نہ ہی فخر عالم کچھ

بولتا۔ کہ اسکے پاس بھی صفائی دینے کو کچھ بچا نہیں تھا۔

دریا پار کر نوالی جگہ پر پہنچے تو وہ کچھ بھی بولے بنا آگے بڑھ گئی۔

"خدا حافظہ بھی نہیں کہو گی۔" وہ اداس سا بولا۔ کہ اسے یقین تھا دھنک کا اس پر سے

اعتماد اٹھ چکا تھا۔

"نہیں۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

اور۔ پتھروں پر پاؤں رکھتی دریا پار کرنے لگی۔

اس پار پہنچی تو نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

فخر عالم اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے پا کر ہاتھ سے دو بویا اور تھکے تھکے قدموں سے

اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

READING
Station

یہ کیا معرہ تھا؟

پہلو میں ایک لڑکی اور شاید دل میں دوسری۔ پر نہیں۔ دھنک نے جلدی ہی اپنے خیال کی۔ تردید کی وہ فخر عالم کے دل میں نہ کبھی تھی نہ ہے اور نہ رہے گی۔

وہ ایک امیر گھرانے کا فلرٹ آدمی تھا اور بس!

چائے سے فارغ ہو کر وہ لوگ پھر سے گھومنے نکلیں۔ راستے میں پھر وہ دونوں مخالف سمت سے آتے مل گئے۔

فخر عالم اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں پیار تھا، اپنائیت تھی۔

مگر۔۔۔ دھنک سیدھی نکل گئی۔ کہ وہ اسکی منزل نہیں تھا۔ وہ اس کا مقدر نہیں تھا!

بھلا دریا کے دو کنارے بھی کبھی مل پائے تھے؟

اسکی زرین خوبصورت آنکھوں میں دو تارے سے ابھرے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں

جھپک لیں۔ مبادا کوئی دیکھ لے!

اسکی چھٹی بھی کل ختم ہو نیوالی تھی۔ پرسوں واپس ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اچھا تھا چلی جاتی۔

اس تہتی آگ کی لپیٹوں سے تو نکل پاتی۔

چلتے چلتے اسکے پاؤں پر ایک پتھر آگرا، اتنا بڑا بھی نہیں تھا۔ چوٹ تو لگی مگر اتنی بھی نہیں

کہ وہ۔۔۔

وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پھر۔۔۔ روتی چلی گئی۔ کہ دل پر بہت بوجھ تھا۔ ہلکا کرنے لگی اسے۔

تسلیم اور نیلم حیران تھیں کہ دھنک تو بہت صابر بہت مضبوط ہوا کرتی تھی۔

مگر پہنچ کر کھانے کے بعد باقی کا سارا وقت وہ بہنوں کیساتھ ٹی وی دیکھتی رہی۔ جبکہ

اس سے قبل وہ باوجود بہنوں کے اصرار کے سیدھی جا کر بستر میں گھس جاتی۔ کہ جب

آنکھیں بند کرتی تو فخر عالم آن پکتا!

اور آج ایسی کوئی ضرورت نہ رہی تھی۔

اپنے آپ کو معروف رکھنے کو وہ اب ہر وقت تسلیم اور نیلم کیساتھ رہنے لگی۔ وہ جہاں جاتیں نہ چاہتے ہوئے بھی ساتھ چل پڑتی۔

ہر شام ابو امی نیلم اور تسلیم کیساتھ باقاعدگی سے نیچے پارک میں جاتی۔ جہاں بیسیوں

ٹورس گھومتے پھرتے نظر آتے۔ وہ لوگ بھی گھومتے پھرتے کبھی تھک کر بیٹھ جاتے۔ کبھی چند

عی دکانوں پر مشتمل بازار میں نکل جاتے۔ سوسے، پکوزے اور چائے جو یہاں کی سوشلسٹی تھی،

کڑی کے میلے کیلے بچوں اور میز پر بیٹھ کر کھاتے۔

مگر۔۔۔ دل تھا دھنک کا کہ چور چور ہو گیا تھا۔ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

سب کیساتھ مل بیٹھتے ہوئے بھی جیسے اپنے کو تنہا محسوس کرتی، بات بات پر چونک اٹھتی۔

آج شام وہ نیلم اور تسلیم کیساتھ چائے کی دکان پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ حسب عادت

نیلم اور تسلیم چپک رہی تھیں۔ جبکہ وہ پیانی ہاتھ میں بکڑے خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

تہی۔۔۔ اسکی نظروں میں دو ہیولے ابھرے۔ پھر دونوں ہیولوں نے فخر عالم اور اس

لڑکی کا روپ دھار لیا۔

لڑکی فخر عالم کے بازو میں بازو ڈالے بازار میں سے گزر رہی تھی۔ شوخ رنگ کے کپڑے

اور تیز رنگوں کے میک اپ میں وہ پورے بازار کی نظروں کا تماشائی فخر عالم کیساتھ چلی جا رہی تھی۔

تو اب تک وہ یہیں تھی!

اچانک فخر عالم کی نظریں چائے کی دکان میں دھنک پر پڑیں۔ فخر عالم کی نشلی آنکھوں

میں جیسے دھپ سے جل اٹھے۔ پر کشش ہونٹوں پر مبہمی مسکراہٹ ابھرا آئی۔ اور۔۔۔ اسے

دیکھتے دیکھتے وہ وہاں سے گزر گیا۔

READING
Station

بارش تیز سے تیز تر ہونے لگی۔ مگر خاصا دور تھا۔ وہ چند قدم پر ٹوٹے پھوٹے کھنڈر نما مکان میں گھس گئی۔ کم از کم ٹین کی چھت تلے وہ چند گھڑی پناہ تو لے سکتی تھی۔

اندرونی کی چھت کی جلتی رنگ اور باہر غصب کی بارش اور ہوا کا طوفان! اسے تو یہ بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

مگر۔۔۔ بارش اور طوفان نے طول پکڑ لی۔ جل تھل ہونے لگا۔ بارش کی جیسے آسمان سے لیکرز میں تک چادری تن گئی اور۔۔۔ وقت سے کہیں پہلے اندھیرا چھا گیا۔ اب وہ کچھ پریشان سی نظر آنے لگی۔

سامنے ڈھلانوں اور چوٹیوں پر کے مکانوں کی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ اچانک جیسے ان گنت تارے آسمان سے ٹوٹ کر پہاڑ پر یہاں وہاں بکھر گئے تھے۔ اس گھپ اندھیرے میں ٹھنڈی بتیاں۔ طوفان باد و باراں اور یہ ٹوٹا پھوٹا کھنڈر! پراسرار سا لگ رہا تھا۔

اس پر کسی کے بھاری قدموں کی چھاپ!

وہ دم سادھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے بارش کی پہلی بوند کیساتھ ہی گھر کی طرف چل پڑنا چاہیے تھا۔ اس طرف کم از کم آبادی تو تھی۔ کسی کے مکان میں بھی گھڑی دو گھڑی کو پناہ لے سکتی تھی۔ وہ پھپھکتی۔

اور۔۔۔ لمحوں میں ہی رین کوٹ پہنچنے بارش میں سر سے پاؤں تک بھیگا۔ فخر عالم اسکے سامنے تھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود وہ اسے پہچان گئی۔

”اوہ۔۔۔ تم بھی یہاں ہو۔۔۔ گڈ ایننگ نیم۔“ فخر عالم نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ان ایڑی سا محسوس کرنے لگی۔

دونوں بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے وہ ٹوٹے دروازے کے چوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ نظریں باہر کے طوفان پر جمادیں۔

”تمہیں یہاں اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔“ اسی طرح باہر دیکھتے ہوئے وہ پھر بولا۔

دھنک نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

کل اس نے واپس جانا تھا۔ آج دن کو سب گھر والے کھانا ساتھ لے کر دو تین میل دور پک تک منانے گئے۔ سہ پہر کو گھر آئے تو وہ تھکی تھکائی اپنے بستر میں گھس گئی۔ سو کر اٹھی تو طبیعت کچھ بحال تھی۔

وہ ہاتھ روم گئی۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ مونگیا گرم کپڑوں پر گرے رنگ کا خوبصورت سویٹر پہنا۔ کپڑوں کے ہر رنگ دوپٹے لے کر جو گزر پہنچے، کپڑوں پر پرفیوم کی سپرے کی۔ اور باہر برآمدے میں نکل آئی۔

گھر خالی پا کر اسے ہنسی آگئی۔ اگر وہ کبھی سو رہی ہوتی تو ان لوگوں نے کبھی اس کا انتظار نہیں کیا۔ بس چل پڑے جدھر منہ کیا۔

وہ بھی باہر آگئی۔ چلتی چلی گئی۔ بازار سے بھی آگے نکل گئی۔ یہاں وہ اکثر رک جایا کرتی تھی۔ دائیں طرف بہت بڑی کھائی تھی۔ جو خاص طور سے اس وقت کبھر سے اٹی پڑی ہوتی تھی۔ کچھ بھی تو نظر نہ آتا تھا۔ سوائے سفید سفید دھند کے۔

دور اس پار البتہ پانچویں چھٹی چوٹی پر لمبی قطار میں درخت ڈوبتے سورج کی سرخی چرائے کھڑے رہتے تھے، اتنے سیدھے اور اتنے برابر فاصلے پر۔ جیسے یونیفارم پہنے فوج کے جوان کسی بہم پر جانے کو تیار کھڑے ہوں۔

معا موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔

وہ تو چھتری بھی بھول آئی تھی۔ نہ ہی رین کوٹ کی ضرورت محسوس کی تھی۔ یہاں یہی تو اکثر دھوکہ ہو جاتا تھا۔ سنہری چمکتی دھوپ میں گھر سے نکلنا اور پل بھر میں اچھی طرح بھیگ کر واپس گھر پہنچنا۔

”بولو گی نہیں۔۔ ہاں۔“ اس نے رخ دھتک کی طرف کر لیا۔

وہ چپ تھی۔

”ہات کرونا۔“

”نہیں۔“ اس نے سرنگی میں ہلا دیا۔

”خفا ہو؟“

اس نے پھر سر اٹکار میں ہلایا۔

فخر عالم دھیرے سے ہنس دیا۔ پھر سے باہر دیکھنے لگا۔

آسمان گرج رہا تھا، بجلی چمک رہی تھی، طوفان بڑھ رہا تھا۔

سردی بے تحاشہ اتر آئی تھی۔ دھتک کے کپڑے ناکافی ہو رہے تھے۔

خاصی بولڈ ہونے کے باوجود پتہ نہیں کیوں اسے آسمانی طوفان اور زلزلے سے بہت

خوف آتا تھا۔ اس وقت بھی بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سے کبھی جا رہی تھی۔

اب تو پانی اندر بھی آنے لگا تھا۔ تیز ہوا بدن کو چیرتی گزرنے لگی تھی۔ سردی حد پھانڈنے

لگی تھی۔

”ادھر آ جاؤ۔“ فخر عالم نے اسے کہا۔

کسا کی جگہ پھر بھی کچھ گزارا تھی۔

”نہیں۔“

وہ اسکی ضد پر دھیرے سے مسکرا دیا۔

”دیکھو گیلی ہو رہی ہو بیمار ہو جاؤ گی۔“

”آچو کیا بیمار بھی ہو گئی تو۔“ جانے کیسے وہ بول پڑی۔

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

”میں بھی بیمار ہو جاؤ گی۔“

وہ طنزیہی مسکرا دی۔

پانی کا تیز ریلہ آیا اور اسے سارا بھگو گیا۔

دھتک نے فخر عالم کی طرف دیکھا۔ مگر اب کے وہ بھی خاموش رہا۔ وہ خواہ مخواہ

ضد کئے جا رہی تھی تو وہ کیا کر سکتا تھا۔

اچانک آسمان زور سے گرجا۔

فخر عالم نہ ہوتا تو دھتک کی جھپٹیں نکل جاتیں۔

وہ اپنی جگہ سے قدرے ہٹ آئی۔

فخر عالم اسے دیکھ دیکھ کر دلنشین انداز میں مسکرا رہا تھا۔

دھتک کو اچھا نہ لگا۔ خوبصورت ماتھے پر ٹھکنیں ابھرا آئیں۔

باہر اچانک گھپ اندھیرا ہو گیا۔ ایسے موسم میں بجلی بھی فوراً نکل ہو جاتی تھی۔ تمام قصبہ

تاریکی میں ڈوب گیا۔

معاذ دورتک بجلی تڑپی۔ تمام علاقے کو پل بھر کر روشن کر گئی۔

اسکا دل ہا قاعدہ دھک دھک کرنے لگا۔ کچھ اور کھسک کر فخر عالم کی طرف ہو گئی۔

وہ اندھیرے میں اسکی گھبراہٹ سے محفوظ ہوتا نہ ہر انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اچھا لگ

رہا تھا اسے یہ سب۔

”یہاں ان دنوں چیتے بھی نکل آتے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

اور دھتک اسکے بالکل ہی قریب چلی آئی۔ خوف سے پھیلی آنکھیں لئے وہ اندھیرے

میں فخر عالم کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک پاس سے ہی کسی جانور کی آواز آئی۔

اور۔۔ دھتک نے بے اختیار فخر عالم کا بازو پکڑ لیا۔

”گیڈر ہے شیر نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

اور جھل سی دھتک نے۔ اپنا ہاتھ اسکے بازو سے ہٹا لیا۔

فخر عالم بمشکل ہنسی روکے اسے دیکھ رہا تھا۔

سورجی

بارش کب تھی؟ آسمان کب خاموش ہوا؟ طوفان کب رکا؟
 انہیں کوئی ہوش نہیں تھا۔ خبر تھی تو بس اتنی کہ دھنک فخر عالم کے بازوؤں میں تھی۔ دونوں
 کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے اور گرم گرم سانسیں ایک دوسرے میں غم ہو رہی تھیں۔
 ”آؤ تمہیں چھوڑ آؤں۔ تمہارے گھر والے پریشان ہو رہے ہونگے۔“ فخر عالم ہوش میں
 آئی گیا۔
 ”چلیں۔“

اور فخر عالم کے نورج کی روشنی میں وہ ہنٹا قدم اٹھاتے اونچے نیچے پتھروں، بڑھلانوں پر
 چڑھتے اترتے۔ دھنک کے فلیٹ کی طرف جانے لگے۔
 ”اوکے۔ گڈ نائٹ۔ سی یو۔“ وہ اسکے گھر سے چند قدم دور ہی رک گیا۔
 ”گڈ نائٹ۔“ وہ بھی دیر سے سے بولی اور۔
 آگے بڑھ گئی۔

اسے یہ فکر نہیں تھی کہ گھر میں پوچھ گچھ ہوگی۔ کیونکہ یہاں کا موسم ہی ایسا تھا۔ گاؤں بھی
 بالکل چھوٹا سا تھا۔ بارش میں کوئی کہیں رک کر اسکے ختم ہونے کا انتظار کر سکتا تھا۔ کسی کے گم
 ہو جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ سو جتنی ہوئی وہ گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

یکدم ہی ایک بار بجلی تڑپی۔
 فخر عالم نے دیکھا دھنک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ پھیلی پھیلی خوبصورت آنکھیں لے۔
 ان نظروں میں کچھ تھا۔ آس! Longing!
 وہ سرشار ہو گیا۔ اپنا ہاتھ اسکی طرف بڑھایا۔ اسے اپنے قریب لے آیا۔
 اور۔۔۔ گڑ گڑاہٹ سے جیسے زمین و آسمان لرز اٹھے۔
 فخر عالم نے سہمی سہمی دھنک کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ بے تماشہ پیار کرنے لگا۔
 ”اب بھی کہو میں تمہیں پیار نہیں کرتا۔ اب بھی کہو فلرٹ کر رہا ہوں، اب بھی کہو میں
 اچھا آدمی نہیں۔۔۔“

وہ خاموش رہی۔ اسکے بازوؤں کے حصار میں خود کو محفوظ سمجھتی اسے نکلتی رہی۔
 ”تمہاری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی سمجھتا۔ کہ فلرٹ ہوں، اچھا آدمی نہیں۔ اگر تمہیں
 پیار کرتا تو تمہیں حاصل کرنے کی سوچتا۔ پر میری جان میری کچھ مجبوریاں ہیں۔“ اس نے
 گہری سانس لی۔ ”تمہیں بتا کر میں پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں چاہتا ہوں بے اندازہ،
 بے پناہ۔ تمہارے علاوہ تو میں کسی کا سوچ بھی نہیں سکتا مگر۔۔۔ کچھ وقت لگے گا۔ تم امید ہے
 میرا ساتھ دوگی۔ میرا انتظار کروگی۔“ اسے پیار کرتے کرتے وہ کہتا گیا۔ اسکے لہجے میں بے
 بسی سی تھی، پریشانی سی تھی۔

اسکی بے بسی پریشانی دھنک کو اپنی روح میں اترتی محسوس ہوئی۔
 جانے کیوں اسے اسکی باتوں میں سچائی کی مہک محسوس ہوئی۔
 دھوتی لڑھک کر اسکے گال بھگو گئے۔

”میرا گھر، میرا ایڈریس، ٹیلیفون نمبر سب تمہیں پتہ ہیں۔ ہم آپس میں ملنے رہیں گے۔
 کب تک؟ یہ میں خود بھی نہیں کہہ سکتا۔ مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم سے
 محبت ہے۔ فلرٹ نہیں کر رہا۔ حقیقت ہے یہ۔۔۔“ اسکی بجلی بجلی آنکھوں پر پیار کرتے
 ہوئے دو دیر سے دو دیر سے کہتا گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

آصف اور دھنک کے درمیان ہفتے میں دو ایک بار ضرور یہ تکرار چلتی۔ آصف کو دھنک اس مطلب سے اچھی لگتی تھی یا نہیں پر کہنا ضرور تھا۔

”وہ جو آٹنی بار بار تکرار کر رہی ہیں انہیں انکار لکھ دو“ آصف نے کہا۔

”اچھا۔ بلکہ میں تو پہلے ہی ایک دفعہ انکار لکھ چکی ہوں۔“
”یہ ہوئی تاہات۔“

”بالکل نہیں ہوئی۔ یہ تاؤ صبح سے کہاں قاب تھے۔ پتہ ہے کچھ بارہن رہے ہیں۔“
دھنک اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”کوئی ضروری کام تھا۔ کسی نے پوچھا تو نہیں تھا؟“

”پوچھا تھا۔ میں نے بہانہ بنا دیا۔ آج مجھے بھی جلدی ہے۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔ گھر جاؤ گی ڈراریسٹ لوگی۔“

”تموڑی دیر ٹھہرو۔ پھر اٹھتے چلتے ہیں۔“

”اچھا۔“

اور آصف کمرے سے نکل گیا۔

پھر ٹھیک ایک بجے آیا۔

”آؤ چلیں۔“

دونوں باہر آگئے۔ آصف کی موٹر بائیک پر دھنک بھی اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی ایسا

ہو جاتا تھا۔ کبھی پریس سے متعلق کسی کام سے، کبھی دونوں کو اٹھنے کوئی اسائنمنٹ ملی ہوتی۔

اور کبھی اسے بس نہ ملتی تو وہ آصف کیساتھ ہی فلیٹ آجاتی تھی۔

دونوں چل پڑے۔ کچھ ہی دور گئے تھے۔ دھنک نے دیکھا۔

فخر عالم تھا۔ آج اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ انکے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

دھنک کی ہیزل آنکھوں میں قدرے بلیں ہی جل اٹھیں۔ خوبصورت ہونٹ مسکرا دیے۔ نازک

سے ہاتھ سے اسے دبو کیا۔

دن بیت رہے تھے۔ بے کیف سے۔ وہ روزانہ رسالے کے دفتر جاتی۔ کان منتظر رہتے کہ شاید فخر عالم کی کوئی خبر ملے۔ پھر سوچتی ابھی تو صرف چند دن ہی ہوئے ہیں اسے واپس لوٹنے۔ ابھی شاید فخر عالم اور بھی رہے گا وہاں۔

یہ کبھی دھنک نے اسکا پروگرام پوچھا تھا، نہ ہی اس نے کوئی خاص بتایا تھا۔ کہ کب لوٹ رہا تھا۔ شاید برف پڑنے تک اس نے وہیں رہنا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دیتی۔

پھر اچانک خوبصورت چہرے پر سائے سے چھما جاتے۔ کیا وہ لڑکی ابھی تک ادھر تھی؟ اور کیا فخر عالم کے نہ آنے کی وجہ وہ لڑکی ہی تھی؟

کون تھی وہ لڑکی؟ کیا تھی فخر عالم کی؟

وہ تو فخر عالم کو اس قدر شدت سے چاہنے لگی تھی کہ واپس لوٹنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ورنہ شاید کوئی اور اسکی جگہ ہوتی تو کبھی کی مایوس ہو کر فخر عالم کا خیال چھوڑ چکی ہوتی۔ اسکی

Will power کہاں گئی۔

دوڑکیوں میں بنے آدمی کا کیا بھروسہ؟

”اے لڑکی۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔“ آصف تھا، اسکا کولیک۔ آتے ہی بیک ڈیسک پر

رکتے ہوئے بولا۔

وہ خیالوں سے چونکی۔ مسکرا دی۔

”اے لڑکی۔ تم بھی مجھے اچھے لگتے ہو۔“ اس نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔

”شادی تم نے میرے ساتھ کرنی ہے۔“

”بس یہی مشکل ہے۔“

وہ کا جواب اس نے بھی دیا۔ نعرن بھی دھنک پر تھی جس پر۔
مجھے لگتا تھا اور اسے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ مجھے تھا بھی تھا مگر چہا بہا تھا۔
کیوں؟ شاید اسلئے کہ وہ آصف کیساتھ بیٹھی تھی؟
اچھا ہوا اسے بھی پتہ چلے یہ آگ کیا ہوتی ہے؟
آصف اسلئے فلین کی طرف مڑنے کا تو فکر عالم نے تیزی سے گاڑی سیدھی نکال دی۔

آج پھر وہ چھٹی کے وقت سٹریٹس کے قریب ہی بس سٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔
تجھی ایک بار پھر نظر مالتھی کہ اس کے پاس آگ کی آگ بھی وہ اکیلا ڈرائیو کر رہا تھا۔
"آؤ۔" پیئرز سیٹ کا دروازہ اس کیلئے کھولتے ہوئے وہ بلا تہیہ بولا۔
وہ کچھ جھجکی رہی تھی۔ جانے دھڑوا لے لے کر کیا سمجھیں؟ موقوفہ پر دیکھتے ہیں سیکڑال
بنے کوئی دیر تو موزی لگتی تھی۔
"آؤ۔" وہ ایک بار پھر بولا اس کے لہجے میں حکم کیساتھ پتہ چل رہی تھی۔
وہ بیٹھ گئی۔ گاڑی چل پڑی۔
"آفس والے باتیں نہ بتائیں اسلئے... " وہ آہستہ سے کہنے لگی۔
"کل موٹر بائیک پر اس لڑکے کیساتھ چکی چلی جا رہی تھی۔ جب باتوں کا ذرا نہیں تھا۔"
اسکے لہجے میں دھمازی تھی۔
نعرن دھنک بھی سمجھ گئی۔
"دو تو... وہ تو میرا کوئی لگ ہے۔"
"کوئی لگ کیا مر نہیں ہوتا۔"
وہ چپ رہی۔ سامنے دیکھنے لگی۔
"آئندہ اگر میں نے تمہیں اس لڑکے کیساتھ دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔" وہ اب بھی نصیحت
میں تھا۔
دھنک کو اچھا نہیں لگا۔ اتنا عجب ڈالے جا رہا تھا۔
"آپ مجھے بلاوجہ ڈانٹ رہے ہیں۔"

پاک سوسائٹی
ڈاٹ
کام

"میں بھی مر جاؤ گی۔" وہ بھی نہیں دی۔

"اچھا سیر۔ سلی۔ کوئی مل احوال ہے ہیں۔ میں فلینس کے معاملے سے باہر ہون کر رہا کروں۔ تم مجھ لینا اور آ جانا۔ پھر کھوئے نظریں کے ادھر ادھر..."

"آپا اور کوئی کام نہیں ہے۔" اس نے اسے ہنسی۔

"اوں ہوں۔" اس نے خوبصورتی سے سرنگی میں ہلادیا۔

جبکہ۔ اس کی اتنی مصروفیات تھیں کہ وہ خود حیران ہوتا تھا کہ کبے وہ دھنک کیلئے وقت نکال پاتا تھا۔

"تم مجھے فون کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"کیا تھا؟"

"کب؟"

"کچھ دن پہلے مگر کوئی افنا نہیں رہا تھا۔"

"ظاہر ہے وہ میرا پرائیویٹ نمبر ہے اور میں صرف پر سوں آیا ہوں۔ اب کرنا۔"

"اچھا۔ مگر زیادہ بات نہیں ہو سکے گی۔"

"کیوں؟"

"آفس کا فون ہو گا؟"

"اوہ۔ تمہارے فون میں نہیں۔"

"نہیں۔"

"بہہ۔" اس نے جھنجھلا کر سنہرے رنگ پر ہاتھ مارا۔ "بس سیدھی سی بات ہے۔ میں تمہارے

فون پر آ کر سب کے سامنے تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں کوئی کیا کرتا ہے..." وہ

جھنجھلایا جھنجھلایا بول رہا تھا۔

اور دھنک دیر دیر سے مسکرائی تھی۔

کچھ دیر دونوں طرف خاموشی رہی۔

"ہاں؟" چند لمحوں کو اس نے گاڑی کی رفتار میں گھم کر لی۔ رخ اسکی طرف کیا ہے۔

آہستہ سے اسے اپنے پہلو سے اگا لیا۔

"اتنا غصہ گزر گیا۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں کہ میں تم سے بچا کر رہا ہوں۔ اور ایک

مرد اپنی محبت کو کسی اور کیساتھ نہیں دیکھ سکتا۔"

"یہی حال ایک لڑکی کا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنے بچا کر میں کسی کو شریک نہیں دیکھ سکتی۔"

دھنک نے بڑی ہوشیاری سے اس لڑکی کا Hint دیا۔

ایک ہل کو وہ گڑ بڑا سا گیا۔ پھر سنہلنے کی کوشش کی۔

"تمہارے بچا کر میں کوئی شریک نہیں ہے۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔

"مگر وہ بھی میرا سیدھا سادا اکو لیک ہے۔"

"جیسا بھی ہے۔" ہے تو غیر مرد۔ دیکھنے والے ہاتھ بنا سکتے ہیں۔" فر عالم نے اسے

بھاننے کے انداز میں کہا۔

"اور... آپ کیساتھ کیا خیال ہے گھومتے ہوئے ہاتھ نہیں بن سکتیں۔"

وہ ہنس دیا۔ خوشگوار سی

"میری بات اور ہے۔"

"کیا ہے؟"

"یہ ہے۔" اس نے ہولے سے اسکا نازک سا ہاتھ دہرایا۔ "وہی ہے تمہیں پتہ ہے میں پر میں

والوں سے الگ ہوں۔ پتہ نہیں کیسے یہ دونوں میں اس طرف آ گیا۔ آئندہ میں تمہارے

فون پر آیا کروں گا۔"

"میرے ساتھ فون میں ایک ٹیچر بھی رہتی ہے۔" دھنک نے مطلع کرنا مناسب سمجھا۔

"ٹیچر؟ پھر کہاں ملیں گے ہم لوگ۔" وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

"میں گے ہی نہیں کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"میں مر جاؤں گا۔" وہ ہنس دیا۔

"اب کس طرف ہم؟"

"لٹ۔ اور تیرا گیت ہمارے فینس کا ہے۔"

"ہوں۔ اور بیکنڈز میں وہ گیت کے پاس تھا۔"

"اچھا۔ خدا حافظ۔ دھنک گاڑی سے نلتے ہوئے بولی۔"

"خدا حافظ۔ لڑکھالی نے ہاتھ بلایا۔"

اور۔۔۔ واپس اپنی راہ پر چل دیا۔

آجکل دو دو جڑوں بہنوں پہنچ کر رات کی ٹھیک ٹھیک زد و یک زد رہتی تھیں۔ کسی دستکاری کے اور نے میں کام کرتی تھیں۔ دھنک کو بچھڑا تو فوراً جا بچھڑا۔ من سے اندر دھکیا۔ بڑی زبردست بکساتیت تھی دونوں بہنوں میں۔ ٹھیکس ایک جیسی۔ تاہم ایک جیسی بہنوں کا انداز ایک سا، ایسی سنجیدگی سب۔ وہ بار بار دھوکا کھا جاتی۔ بڑا لالچسپ پہنچتا ہوا ہاتھ میگزین کیلئے!

گرمی کا زور ختم ہو چلا تھا۔ دن چھوٹے راتیں طویل پکڑ رہی تھیں۔ برسوں سے بارل آ جا رہے تھے۔ بس دو ایک بارشوں کی دیر تھی اور پھر۔۔۔ سردی!

سردی کا موسم اسے بے حد اچھا لگتا تھا۔ سردی کی آمد اپنے ساتھ انوکھی خوشی کا پیغام لاتی تھی۔ اور اس دفعہ تو فخر عالم بھی انکی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ زندگی اچانک کتنی حسین ہو گئی تھی۔

اس وقت پھر وہ ان دو بہنوں کی طرف رواں دواں تھی۔ آج آخری نشست تھی اور پھر فیچر مکمل ہو جاتا تھا۔ کندھے سے بیک لاکائے تیز تیز قدم اٹھاتی وہ فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ زیر اسگ پار کرنے لگی تو نظر بائیں طرف کی ایک کار پر جا پڑی، فخر عالم تھا۔ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور... اور... وہی لڑکی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی۔ شاید اسے کہیں لے جا رہی تھی۔

وہ کسی طرح کراسگ پار کر رہی تھی۔ گودل تھا کہ کڑیاں ہو گئی تھیں انکی ہر بڑھ بڑھ ہو گیا تھا۔

اور۔۔۔ اسے اچانک احساس ہوا فخر عالم میں اور اس میں اتنا ہی فرق تھا جتنا فٹ پاتھ

پر چلے والوں اور کاروں میں چلنے والوں میں ہوتا ہے۔

وہ اور ہی آج ہی اس بات کو ختم کیوں نہیں کر دیتا؟

وہ جانتی تھی فخر عالم اسکے دل میں دھڑکن بن کر دھڑک رہا تھا، روح بن کر جسم میں سوئی تھی۔ گروہ اپنی توہین بھی تو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حالات ایسے ہو گئے تو وہ سو فخر عالموں کو اپنی عزت پر قربان کر سکتی تھی۔ اور۔۔

اس نے تہیہ کر لیا۔ وہ اس سے قطع تعلق کر لے گی!

جیکے ساتھ میں وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ ایسا کرنے میں وہ نوٹ پھوٹ جائیگی، بھر بھر جائیگی۔

ان لڑکیوں کے اندر یوں سے فارغ ہو کر وہ سیدھی اپنے قلب پر گئی۔ کچھ دیر تو یوں ہی بے سدھی بستر پر اونٹنی پڑی رہی۔ ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا اور کسی بھی قسم کی سوچ، غور و فحش کے قابل نہ رہا تھا۔

پھر جانے کس وقت فرزانہ آگئی۔ دھنک نے سر اٹھا کر دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی۔

”کیا بات ہے دھنک۔“ وہ پاس بیٹھ کر چارے سا کئے بالوں میں ہاتھ بھیرتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔“ اور اسکی گود میں سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کب تک یہ لاوا اسکے ذہن و دل میں پکار رہا۔ کبھی تو باہر نکلا ہی تھا اس نے۔

”میں دیکھ رہی ہوں کافی دنوں سے تم میں بہت چیخ آ گیا ہے۔ کبھی بہت خوش دکھائی

دیتی ہو۔ کبھی کچھ سوچتی ہوئی کم کم۔ مجھے بتاؤ شاید تمہارے دل کا بوجھ کچھ ہٹا ہو۔“ وہ بھر روئی

سائیکے آنسو اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچتے ہوئے بولی۔

”ہاں فرزانہ کبھی میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ اور کبھی کم کم۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ بھر روئی۔

”بتاؤ گی نہیں کیا بات ہے؟“

”یہ تو مشکل ہے میں بتا نہیں سکتی۔“ وہ روتے روتے بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے مت بتاؤ۔ غمزدہ ہو لو۔ کیا حال کر لیا جانے لگا، کھانا کھاتے ہیں پھر

پہنتے ہیں۔ بڑی اچھی سوڈی لگی ہے دیکھیں گے۔ آج آخری دن جاسکا۔“

”میں سوڈی نہیں دیکھوں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میرا دل نہیں کھتا۔“

”چلو شاباش تم منہ دھولو اور آؤ میرے پاس۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔“

وہ منہ ہاتھ دھو کر پراگتی۔ فرزانہ نے کھانا گرم کر کے کھانے لگایا۔ خود بھی بیٹھ گئی۔

”دھنک دھنک۔ تم مجھ سے پھوٹی ہو۔ میرا فرض ہے تمہیں سمجھانا۔ جس رو پر تم چلنا چاہتی

ہو۔ پھوٹ پھوٹ کر قدم اٹھاؤ۔ یہ راستے بڑے دشوار ہوتے ہیں۔ اور میں کبھی نہیں

چاہوں گی کہ تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔“

دھنک نے چوتھ کر اسے دیکھا۔ کیا وہ سب جانتی تھی؟

”مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ مگر یہ ضرور کہیں گی کہ بہت احتیاط سے

کام لیتا۔ جذبات سے زیادہ عمل سے کام لیتا۔“ وہ کھانا شروع کرتے ہوئے پھر یوں

دھنک کو کھنسی بولی۔ ہاں دل ہی دل میں فرزانہ کی ممنون ہوئی۔ ایک خیر خواہ اس سے

زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے؟

شام کو فرزانہ اس سے زبردستی سوڈی کھانے لے گئی۔

کانی رش تھی۔ آخری دن جو تھا قلم کا۔ وہ دنوں بھی تخت لے کر گیلری میں جا بیٹھی۔

قلم شروع ہوئی واقعی اچھی تھی۔ دنوں دن کھینچنے لگی۔ بڑیک ہوئی تو محبت

نونی۔

بال میں جیاں۔ جل اٹھی۔ وہ دنوں کھانا ہو کر بیٹھ گئی۔

محالے پیچھے بوسے سے فخر عالم کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ جھک کر دھڑکی دیکھا۔

وہی لڑکی فخر عالم کے کندھے سے سر نکالتے بیٹھی تھی۔ اور فخر عالم اس سے باتوں میں

مصروف تھا۔

اجنبیت لئے تھا۔

”تم یوں نہیں مانو گی۔“ وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

آس پاس کی پرواہ کئے بغیر اسے بازو سے پکڑ کر باٹھنے ہوئے پینرز بیٹ تک لایا۔
بنا یا دور دروازہ بند کرتے ہوئے اپنی سیٹ پر آیا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور آگے بڑھنے لگا۔

”اب بتاؤ کیا ہوا ہے تمہیں؟“ نظر عالم نے ابتدا کی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

”تو پھر یہ حالت کیوں ایسی بنا رکھی ہے۔ بات کیوں نہیں کر رہی ہو۔“

”میری مرضی میں جس طرح بھی رہوں۔“

”آخر کچھ تو پتہ چلے۔“ وہ جھنجھایا ہوا سنا تھا۔

”کچھ بھی نہیں ہے۔“

”بتاؤ ورنہ...“ وہ تیز ہو رہا تھا۔

”کیا کر لیں گے۔“ وہ بڑے تحمل سے بولی۔

اس نے گہری سانس لی۔ پیسے طے شدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

”اس لڑکی کی وجہ سے خفا ہو۔“

”مجھے کیا آپ جس کیساتھ بھی بھریں۔“

”تمہیں کوئی پرواہ نہیں میں جو بھی کروں؟“ گاڑی ایک طرف روک کر اس نے رخ

اسکی طرف کر لیا۔

”بالکل نہیں۔“

”اسکا مطلب ہے میں تمہارا کچھ بھی نہیں۔“

”ہاں۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہیں۔“

”کچھ بھی نہیں ہوں۔“ ساتھ ہی جانے کیسے اس کا ذہن ہاتھ اسکے پھول سے گال پر جا پڑا۔

”کچھ بھی نہیں ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہیں۔“ وہ گال پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

نظر عالم کی نظر بھی دھنک پر مگی۔ وہ کچھ چورسا نظر آنے لگا۔

دور۔۔۔ دھنک رخ واپس سوز کر اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

ظلم میں آگے کیا ہوا؟ کب ختم ہوئی؟ اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ فرزانہ ہی اسے ہاتھ سے
حمام کروگوں کی بھیل میں سے باہر نکال لائی۔

قلیت پر پہنچی کر وہ پھر بستر میں پڑ رہی۔ ایک بار پھر بلک بلک کر رو دی۔

ابھی تھوڑی ہی دور ہوئی تھی۔ نیچے سے جانا پچھانا سا ہارن ابھرا۔

پہ نظر عام کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مگر وہ بر گز نیچے نہیں جا سکی اس نے سوچا۔ اور اسی طرح

اوندھی بستر پر پڑ رہی۔ اب بھی ڈھیر سارے آنسوؤں کے درمیان پھکیاں لیتی۔

ایک بار پھر ہارن ہوا۔۔۔ اب بھی اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر تھوڑی دور بعد نچلے

قلیت کا دس بارہ سالہ جامہ اوپر آ گیا۔

”باقی دھنک آچکے کوئی نیچے با رہا ہے۔“

اس نے نکلے سے ہی چہرہ رگڑ کر آنسو نکل گئے۔ اچھا تھا فرزانہ ہاتھ روم میں تھی۔ نہ

چاہے ہوئے بھی وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ نیچے آنے لگی۔ کہ فرزانہ یا پھر یہ جامہ یا اسکے گھروالے کیا

سوچتے کون آیا تھا جسے وہ ملنے سے کتر رہی تھی۔ نہ جاتی تو بیسیوں باتیں ہوتیں۔

وہ سامنے سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گئی۔

چپ چاپ۔ بولنے کو تھا بھی کیا؟

”آؤ جینو گاڑی میں۔“ وہ متانت سے بولا۔

دھنک کے ٹکڑے ہال، بیگا بیگا چہرہ، سرخ متورم آنکھیں بتا رہی تھیں جو اس پر بیٹ

رہی تھی۔

وہ چپ رہی۔ سوائے ایک گہری سی سانس کے۔

”بٹھو نا۔“ اس نے اصرار کیا۔

”جو بات کرنی ہے ادھر ہی کر دیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ آخر وہ بول ہی پڑی۔ لہجہ کھم

اور۔۔۔ فخر عالم نے گہری سانس لی۔
 ”او کے۔ گڈ ٹائمٹ“۔ اس نے اسکا ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔
 ”گڈ ٹائمٹ“۔ وہ بھی ہولے سے بولی۔
 اور گاڑی سے نکل کر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے قلب کی طرف بڑھی۔

”چند ہیے فخر عالم اپنے اسی ہاتھ کو بند کرنا کھولتا رہا۔ مگھورنا رہا اسے۔۔۔ جیسے اپنے کے
 پر پچھتا رہا ہونا نام ہو۔
 پھر۔۔۔ آہستہ سے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کے احتجاج کے باوجود سینے سے
 بھینچ لیا۔ اسکی نہیں نہیں کے باوجود اس کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیئے۔
 ”میں ہی تمہارا سب کچھ ہوں۔ صرف تمہارا ہوں۔ کل بھی تھا، آج بھی ہوں، اور ہمیشہ
 رہوں گا۔۔۔“ وہ کہتا رہا۔

اور۔۔۔ اس کے پیار میں بے بس دھنک انداز خود سپردگی لئے اس کے بازوؤں میں مقید پھوٹ
 پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اپنا فیصلہ پھر بھلا کر اپنا ارادہ رقطح تعلق پھر بھول بھال کر۔
 کیا تھا اس میں۔۔۔ جو چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے تعلق توڑ نہ پار ہی تھی۔
 ”اچھا اب مسکرا دو پلیز“۔ اسکا بھیگا بھیگا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔
 وہ چپ رہی۔۔۔ اب بھی سواندیشے، سوشکوے تھے سرخ متورم آنکھوں میں۔
 فخر عالم نے باری باری اسکی دونوں آنکھوں پر پیار کیا۔
 ”مسکرا دو نا“۔

اور وہ۔۔۔ انفرادگی سے مسکرا دی۔
 یہ بھی بہت تھا۔ فخر عالم نے اسے پہلو سے لگائے لگائے گاڑی سٹارٹ کی۔ آبادی سے
 باہر نکل کر کافی دیر تک ادھر ادھر بے مقصد گاڑی دوڑاتا رہا۔
 آخر کار۔۔۔ پھر اسے اس کے قلب پر لے آیا۔
 ”زیادہ سوچا نہیں کرو۔ ہوں۔“
 وہ پھر ہولے سے مسکرا دی۔ بے یقینی سے، بے اعتمادی سے۔
 ”مجھ پر بھروسہ نہیں۔“
 ”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

سوسائٹی
 ڈاٹ کام

THE
 READING
 Platform

وہ بھی چل دیا۔ واقعی دیر ہو رہی تھی اسے۔

دھنک تیار ہوئی۔ آفس جانے کیلئے بس سٹاپ پر آئی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ کہ سامنے سے جیب آتی دکھائی دی۔ وہی جیب تھی جو کچھ دیر قبل فلیٹس کے گیٹ کے پاس کھڑی تھی، جس میں فخر عالم تھا اور جس نے ہارن دیکر اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ جیب پاس سے گزرنے لگی تو اس نے دیکھا جیب ڈرائیور چلا رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر فخر عالم تھا اور فخر عالم سے چٹھی۔ وہی لڑکی بیٹھی تھی۔

دھنک کو فخر عالم کے دورخی رویے پر غصہ کی بجائے افسوس ہونے لگا۔ کہ غصہ تو پہلے بھی اسے کئی بار آچکا تھا۔ دکھ بھی ہوا تھا۔ مگر۔

اس وقت افسوس ہو رہا تھا۔ اتنی ہادقار شخصیت، اتنا بڑا آدمی، اتنا نامی گرامی خاندان۔ اور اتنی اوجھی حرکت۔۔۔ بیک وقت دو لڑکیوں کیساتھ معاشرہ!

اور کیا پتہ۔ وہ طنز سے ہنس دی۔ دو سے بھی کہیں زیادہ لڑکیاں ہوں۔ جنہیں وہ بیک وقت Handle کر رہا تھا۔

اس نے گہری سانس لی۔ پھر سر جھٹک دیا۔

یہ آدمی کم از کم اسکی سمجھ سے باہر تھا!

بس آئی اور وہ بیٹھ کر آفس چل دی۔

”آئیے مس دھنک تشریف لائیے۔“ اسے دیکھتے ہی آصف بولا۔

وہ مسکرا دی۔

”کیوں۔ کوئی خاص خبر ہے کیا۔“

”ہاں۔ وہ جو تمہارا دشمن تھا۔ مسٹر فخر عالم۔ آجکل اس کیساتھ ایک لڑکی گھومتی پھرتی نظر آتی ہے...“

دھنک کا دل دھڑک اٹھا۔ کہیں وہ خود دھنک پر تو چوٹ نہیں کر رہا تھا؟

صبح کی نماز سے فارغ ہو کر وہ فلیٹ کے آگے برآمدے میں نکل آئی۔ صبح کی سپیدی میں نقاس جھٹک رہا تھا۔ سامنے موٹیا کی تیل میں بس اکا دکا پھول ہی کھلے تھے۔ سفیدے کے درختوں کے پتے تلخے ہو رہے تھے۔ خزاں پر پھیلانے چھا جانے کو تیار تھی۔

مختصر سا ہارن ہوا اور اسکی محویت ٹوٹی۔

دیکھا میں گیٹ سے قدرے پرے فخر عالم کی جیب کھڑی تھی۔ اکیلا تھا۔ اسے ہی متوجہ کرنے کو ہارن دیا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اسکے قدم میڑھیوں پر اترنے کو بڑھے۔

”میں جا رہا ہوں پہاڑ پر۔ رات ہی مینیجر کا فون آیا تھا کچھ ضروری کام ہیں دیکھنے کو۔ سوچا تمہیں بتانا چلوں۔ ورنہ پھر نہ پھلا بیٹھو گی۔“ وہ خوش گواری سے بولا۔

”کب واپس آئیے گی؟“ اس نے یوں ہی پوچھ لیا کہ اب اسکا دل کسی خاص خوش فہمی میں جمانہ تھا۔

”جلدی آؤنگا۔ پرسوں تک شاید۔ تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں کہیں۔“

وہ مسکرا دی۔ باوجود کوشش کے مسکراہٹ کا طنز چھپانہ سکی۔

”اچھا چلا ہوں دیر ہو رہی ہے۔ ہاں۔“ اس نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔ ہائے۔“ وہ مڑنے لگی۔

اور فخر عالم۔ مسکرا دیا۔ کچھ افسردہ سا۔ کہ وہ کسی طرح اسکے پیار پر یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔

”بابائے۔ سی یو۔“

”ہاں۔ کل آئینکے پھر۔“ دھنک نے کہا۔
اور دونوں موٹر بائیک پر بیٹھ کر چل پڑے۔

سروسائیگی
کام

”کون لڑکی؟“ وہ آہستہ سے بول پائی۔
”یہی تو پتہ کرنا ہے وہ کون ہے؟ مسز فخر عالم کا اس سے کیا رشتہ ہے؟ میگزین سچ جاویں
اس خبر سے۔ اتنا نامی گرامی اور لڑکنگ شخص شخص ایک لڑکی کو لئے لئے پھرتا ہے۔ کیا اس سے
شادی تو نہیں کر سکتا؟ دونوں کی تصویر بھی ہو جائے...“
”چھوڑ دو بھی۔ یہ اسکا پرسنل معاملہ ہے“ وہ بے مشکل بولی۔

”اوں ہوں۔ وہ ملک کے گنے پنے امیروں میں سے ہے جس نے کئی فلاحی ادارے
کھول رکھے ہیں۔ جو قوم کی خلوص دل سے خدمت کرتا ہے۔ ہیرو ہے قوم کا سو پبلک پراپرٹی
ہوئی نا۔ اسکی ہر Activity پتہ چلنا چاہیے قوم کو...“
”اسکو چھوڑ دو کوئی اور بات کر دو۔“

”کیسے چھوڑوں۔ پتہ ہے جب سے اصلی مجرم پکڑا گیا ہے۔ لوگوں کو کتنی ہمدردی ہو گئی ہے
اس کیساتھ کوئی اسکی سہیلنگ پر سہیلنگی کی بات کرتا ہے تو کوئی اسکی وسیع القلمی کی۔ لڑکیاں
تو اس طرح سے جنس ہیں اسکے بارے میں کچھ جاننے کو...“

”چپ بھی کہو۔ عالم۔ عالم۔ اور کوئی جیسے ہے ہی نہیں اس دنیا میں“ اسکا جیسے
”Topic سے مر پئے گا۔“

”گنہگار تمہارا دشمن ابھی تک جاری ہے پچارے سے“ وہ کچھ حیران سا بولا۔
”بل جلد سے جواب ٹھہرانا ہے گدا گروں کی تلاش میں۔ سرنے کہا تھا جلدی مکمل
گنہگار تھی۔“

”تمہارے تھوڑے سا نہیں۔“
”جیسے مجھ سے۔“
”گناہگار تھی۔“
”نہی۔“
”گناہگار تھی۔“

READING
Station

درمیان میں رکھی میز پر سیدھی پھیلا دیں۔

دھنک اسکے پاس سے گزر کر اپنی کرسی کی طرف جانے لگی۔

فخر عالم نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ اپنی کرسی کے بازو پر بٹھا لیا۔

”سناؤ۔ کیسے رہیں اتنے دن؟“ اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ اپنا نیت سے

بولی۔

”ٹھیک“

”ٹھیک تو نہیں لگ رہیں۔“

اسکے چہرے پر اداسی کی گہری چھاپ چھپ تو نہیں سکتی تھی۔

وہ چپ رہی۔

”بولو نا۔ باتیں کرو نا۔ بہت سی ڈھیر ساری۔ میں تو ترس گیا تھا اتنے دن تمہاری آواز کو۔“

”اچھا۔“ وہ ڈھیر سے مسکرا دی۔ طنزیہ اداس مسکراہٹ۔

”میں نے دو بار تمہیں فون بھی کیا تھا مگر تم اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں کہیں باہر نکلی تھیں۔

تمہیں نہیں بتایا کسی نے؟“

”اوں ہوں۔“

”Hell... اتنی مشکل سے تو وہاں سے کال بک ہوئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ اداس سی مسکرا دی۔ ”کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”کیوں طنزیہ طنز کر رہی ہو۔ میں بچہ ہوں جو نہیں سمجھتا۔“ وہ اچانک بھراٹھا۔ ”میں

جلدی اسلئے نہ آسکا کہ میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ڈاکٹر آئی کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔“ اسکا

خیال تھا وہ اسکی دیر سے آمد پر خفا ہے۔

”میں نے کب کہا آپ دیر سے آئے ہیں۔“ دھنک کالب دلجو اب بھی وہی سنگینی لئے تھا۔

”تم نے نہیں کہا میں تو محسوس کرتا ہوں نا۔“ اسکا لہجہ اب بھی تیز تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ذہن پر بوجھ مت ڈالیں۔“

دن مختصر تر ہوتے جا رہے تھے۔ گلابی دن ڈھلتے ہی سیندھری شامیں اتر آتی تھیں۔ یونیا

ہانڈی اور ہوا کے جھونکے موسم کو سرد بنا رہے تھے۔ سردی۔ جسکا تصور ہی اس کی روح میں

خوشیوں کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ اب کے کچھ اداس اداس تھی، افسردہ افسردہ تھی۔

کافی دن ہو گئے تھے اسے فخر عالم کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ نہ کوئی فون آیا تھا نہ وہ خود۔ نہ ہی

دھنک نے فون وغیرہ کر کے اسکا پتہ کیا تھا۔ گو وہ فخر عالم کو دل سے نکال نہیں سکتی تھی مگر خود

سے ملنا ملنا پتہ لگانا۔ یہ بھی سب اس نے چھوڑ دیا تھا۔

کچھ عرصہ قبل وہ کتنی شوخ و چنچل، چاق و چوبند ہوا کرتی تھی۔ حاضر دماغ حاضر جواب۔

پر اب تو۔۔۔ جیسے اپنے آپکو کھینٹ رہی تھی۔ خوبصورت چہرے پر اداسی کی مستقل چھاپ

لگ گئی تھی۔ لاکھ خود کو مصروف رکھتی مگر دل تھا کہ۔۔۔ بچھ کر رہ گیا تھا۔

آج وہ رسالے کے دفتر نہیں گئی تھی۔ بہت تمکا تمکا سا محسوس کر رہی تھی۔ رات کے

کپڑوں ہی میں آرنڈ چیر پر کھلی کھڑکی کے قریب بیٹھی باہر غلاؤں میں گھور رہی تھی۔

دفتر دروازے پر دستک ہوئی۔

بادل خواستہ وہ اٹھ کر دروازے پر گئی۔ کھولا۔

فخر عالم تھا۔ مجسم اشتیاق، مجسم خوشی!

چہرے پر خوشی کی دمک، ہونٹوں پر دلآویز تبسم!

”آپ... آپ کیسے...؟“ وہ کچھ حیران سی ہوئی۔

”تموڈی دیر پہلے میں نے تمہارے آفس فون کیا۔“ وہ اندر آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”پتہ چلا تم نہیں آئیں۔ میں ادھر آ گیا۔“ وہ آرام سے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں

"دھنک۔ میں۔ مجھے ان ڈائریکٹ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ صاف صاف بتاؤ اگر میری دیری پر نہیں تو پھر کس بات پر خفا ہو۔"

"میں... مجھے بھی ایسا آدمی پسند نہیں جسے کوئی اور بھی پسند کرتا ہو۔"

"اوہ۔ اسکا جیسے ذہن سے بوجھ اتر گیا۔ اور ساتھ ہی کہ وہ جان گئی تھی کہ فریدہ اس کیساتھ تھی۔"

"وہ... لڑکی کون ہے؟"

وہ چپ رہا۔ خاموشی سے اسے تکتا رہا۔

"گرل فرینڈ ہے؟"

وہ اب بھی چپ تھا۔

"آپکا اچھی لگتی ہے؟"

اور وہ۔ اب بھی خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اسکی خاموشی ان باتوں کی تصدیق نہیں تو اور کیا تھی؟

دھنک ہاتھ چمڑا کر اٹھنے لگی۔

مگر۔ فخر عالم کی گرفت مضبوط تھی۔ آہستہ سے اسکا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"مجھے تم اچھی لگتی ہو اور بس۔" پرکشش لب اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے وہ دھیسے لہجے

میں بولا۔ "میری تم ہو صرف تم۔ اور کوئی نہیں ہے..."

فخر عالم کی مخصوص مہک دھنک کو اپنی سانسوں میں اترتی محسوس ہوئی۔ وہ پھر اپنی خفگی بھول رہی تھی۔ پھر اسے چاہنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ کتنی بے بس تھی وہ فخر عالم کے سامنے۔

"یہاں کیا ہوا؟" وہ فخر عالم کے ماتھے پر لگے زخم کے اوپر چھوٹی سی چوکور پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"شکر ہے تمہیں خیال تو آیا۔" پھر آستین اوپر کی۔ بازو پر لگے زخم اسے دکھائے۔

"یہاں بھی زخم آئے تھے۔ ٹانگوں پر بھی آئے تھے..."

"کس طرح ہوا ایکسڈنٹ؟" وہ وہیں اسکے سینے سے لگی بیٹھی تھی۔

وہ جیسے کچھ سوچنے لگا۔ کچھ اکٹھا کرنے لگا۔ کڑیاں جوڑنے لگا۔

پھر۔ گہری سانس لی۔ پھر مسکرا دیا۔

"میری جیب کی بریکس فیل ہوئی تھیں۔" اس نے اتنا ہی کہا۔

"مگر... وہ پریشانی میں سیدھی ہو بیٹھی۔" آپ پوری بات تو بتائیں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ وہی مخصوص دل میں اترنے والی ہنسی۔

"میری گورنس کا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ یہ فریڈہ نے فیل کروائی تھیں۔"

"فریڈہ کون؟"

"وہی لڑکی۔ جو تمہیں اچھی نہیں لگتی۔"

"وہ کیوں کرتی ایسا؟" وہ تو فخر عالم کو بہت چاہتی تھی جیسے۔

"یہی تو میں کہتا ہوں۔" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

دھنک چپ سی ہو گئی۔

"ماما کا خیال ہے۔ میری جان کے پیچھے کوئی لگا ہوا ہے۔ پہلے میری ہی غلطی میں سمیٹ

کو مار ڈالا۔ سمیٹ کا منگیتر میرا ماموں زاد ہے۔ میری Step Mother کا بھتیجا ہے۔ وہ

جیل گیا تو اب فریڈہ میری زندگی کے پیچھے لگ گئی ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ ماما کہتی ہیں یہ

سب ایک ہی سکیم کی کڑیاں ہیں۔ پہلے بابا کو زہر دیا گیا۔ اس وقت تو میں سویٹزر لینڈ میں تھا۔

کچھ کہہ نہیں سکتا سچ تھا یا غلط۔ اب میری ٹھیک ٹھاک شکار پر تیار جانے کیلئے جیب کی بریکس فیل

کرا دی گئیں۔ میری عادت ہے سفر پر جانے سے پہلے میں گاڑی اچھی طرح چیک کرتا ہوں۔

اس وقت واقعی سب ٹھیک تھا۔ پھر لمحوں میں پتہ چلا بریکس فیل ہیں۔ تب میں چل پڑا تھا۔

گاڑی کسی طرح قابو نہیں آرہی تھی۔ پہاڑی راستے کی چکر دار سڑکیں، اترائی۔ مجبوراً گاڑی

پہاڑے ٹکرائی پڑی۔ تبھی جا کے کہیں رکی۔ بس مرا نہیں۔ یہ دیکھو زندہ ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"وہ لڑکی آپ کیساتھ نہیں تھی؟" جبکہ وہ فخر عالم کو لمحہ بھر کو اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔

”یہ ایک پوائنٹ سٹرائیک کرنا ضرور ہے کہ پروگرام اسکا بھی ساتھ چلنے کا تھا۔ میں نام پر طبیعت کی خرابی کا کہہ کر وہ نہیں گئی۔ بہر حال ماما کہتی ہیں کہ یہ سب اس خاندان کو ختم کرنے کی چالیں ہیں۔ پہلے بابا پھر میرے بدلے میں سمینہ — اب پھر میرے پیچھے کوئی لگا ہے۔ ہمہ... یہ پیسہ کیا چیز ہے۔ زندگی تک محفوظ نہیں رہتی۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں یہ سب چھوڑ چھوڑ کہیں نکل جاؤں۔ جہاں خلوص ہو، سچائی ہو، سچی محبت ہو۔ بعض اوقات مجھے اپنا آپ بہت تنہا محسوس ہوتا ہے اکیلا۔ ہوں نا اکیلا۔“

دھنک نے دیکھا اسکی خوبصورت آنکھوں میں اداسی اتر آئی تھی، دکھ و ریا تھا! اسکی اداسی، اسکا دکھ، دھنک کو اپنی روح میں اترتے محسوس ہوئے۔ اسکی زرین آنکھوں میں سرخ سنہری رنگ دھواں دھواں ہونے لگے۔ اور — کنارے بھیگ بھیگ گئے۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

اور — دو موٹی لڑھک کر اس کے خوبصورت گالوں پر آرہے۔

”تم ابھی سے رونے لگیں۔“ انسرودہ سی مسکراہٹ سے اس نے اپنی انگلیوں سے اسکے آنسو پونچھے۔ ”ابھی تو کئی امتحان اور ہیں۔ تم میرے ساتھ ہوگی تو ہر مشکل آسان ہو جائیگی۔ میرا ساتھ دو گی نا!“

”ہاں۔“ اس نے اب بھی صرف سر ہی اثبات میں ہلایا۔ کہ زبان ساتھ نہ دے پارہی تھی۔

”بس پھر سب ٹھیک ہو جائیگا۔ میں تمہیں خود کسی دن سب بتا دوں گا... اور اب اٹھو شاپاش۔ کوئی پلاؤ۔“

اور وہ انگلیوں کی پوروں سے آنکھیں خشک کرتی کچن کی طرف چل دی۔

سردی زوروں پر تھی — دن گھٹ گئے تھے، راتیں طویل۔ ادھر دن نکلتا تھا ادھر شام اتر آتی تھی۔

سامنے کیاری میں کھلے زمرس بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ گل داؤدی اپنے جوہن پر تھی جبکہ — کونے والے ادنیٰ درخت سے لپٹی Morning Glory اکا دکا پھول لئے سردی کی شدت کے سامنے بے بس نظر آرہی تھی۔

برآمدے سے اندر آ کر وہ جلدی جلدی آفس جانے کیلئے تیار ہونے لگی۔ آفس پہنچ کر اپنے ڈیسک پر بیٹھی ہی تھی کہ سامنے رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

آصف نے اٹھ کر ریسیو کیا۔

دھنک کی توجہ ادھر ہی لگی تھی۔ کہیں فخر عالم کا تو نہیں تھا؟ کہیں آصف نہ سمجھ جائے سب؟

”کوئی صاحب تمہیں پوچھ رہے ہیں۔“ آصف نے ریسیور ایک طرف رکھتے ہوئے اسے کہا۔

وہ جلدی سے اٹھی۔ فخر عالم کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔

اسکا دھڑکتا دل سنجنل گیا۔ اب فخر عالم اتنا بھی بیوقوف نہیں تھا کہ رسالے کے دفتر میں اپنی شناخت کرواتا۔

اس نے ریسیور کان سے لگایا۔

”ہیلو — فخر عالم بول رہا ہوں۔“

”پتہ ہے۔“ وہ مسکرا دی۔

”ہاں نا۔ بچا امیر اول جو تمہارے پاس ہے دھڑک کر بتا دیا ہوگا کہ فخر عالم ہے بدلے

بعد پھر رنگ کرینگے۔“ آصف ہر بات میں اسی طرح اسے چھیڑا کرتا تھا۔
 ”ہوں۔“ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ڈیسک پر رکھی فائل کھول لی۔
 ”مس دھنک۔“

”جی۔“

”میری سکیم فیل ہوگئی۔“ وہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے بولا۔
 ”کون سی سکیم؟“

”وہی۔ مسز فخر عالم کے متعلق پتہ کرنا کہ وہ کس لڑکی کو ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔“
 ”میں نے تمہیں کہا تھا خواہ مخواہ کسی کے پرائیویٹ معاملات میں دخل مت دو۔“

”مسز عالم کے معاملات پرائیویٹ کہاں ہیں۔ پرنس کا پرنس ہے۔ یہ دیکھو اخبار میں
 کیا لکھا ہے۔ عام آدمی ہوتا تو یوں اس کے متعلق خبریں چھپتیں۔ میرے تمہارے بارے
 میں کوئی کیوں نہیں لکھتا۔۔۔“ اس نے اخبار کی ایک خبر اسکے سامنے کی۔

سکیننگ کرتے ہوئے کسی نامعلوم شخص نے اسے دھکا دیا تھا۔ جسکی وجہ سے وہ نیچے ٹک
 لڑھکتا ہوا چلا گیا تھا۔ نامعلوم شخص سکیننگ ہی کے لباس میں بظاہر سکیننگ کر رہا تھا۔ مگر پھر
 غائب ہو گیا۔ وہ مقابلے میں حصہ لینے والوں میں سے نہیں تھا۔ لگتا تھا باہر سے اسی مقصد
 سے آیا تھا کہ مسز عالم کو کسی طرح ختم کر دے۔ مگر باوجود شدید زخمی ہونے کے انکی جان بچ گئی۔

معاذوں کی گھنٹی بجی۔ اور دھنک جلدی سے اٹھی۔ ریسیو کیا۔

فخر عالم ہی تھا۔ ہسپتال سے بول رہا تھا۔ اسے آنے کو کہا تھا۔

”آصف میں جا رہی ہوں ذرا کام ہے۔ کوئی پوچھے تو کہنا ہسپتال گئی ہے۔“ وہ اپنا

بیک کندھے سے لڑکاتی ہوئی جانے لگی۔

”سنو۔“ آصف سنجیدگی سے بولا۔

”کیا ہے؟“

”ان حضرت سے صاف صاف کہہ دینا میں تمہارا امیدوار ہوں۔ خواہ مخواہ نمبر بنانے

میں دل مانگ رہا ہے۔“

”وہ تو میں کبھی کاوے چکی آچکا۔“

”I am lucky then.“

”اور کیسے ہیں آپ؟“

”فرسٹ کلاس۔ بس تمہیں یہ بتانا تھا کہ میں گیارہ بجے روانہ ہو رہا ہوں سکیننگ
 کمپیشن پر۔“

اور۔ دھنک کا دھیان یکدم فریڈ کی طرف گیا۔

”اور کون جا رہا ہے ساتھ۔“

”کوئی نہیں۔ تم ذہن پر یوجھ مت ڈالو۔ اوکے چلتا ہوں۔ ہاں۔“

”Take care.“ وہ کھنکائی گئی تھی۔

ریسیور اپس کریڈل پر رکھ دیا۔ تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی ڈیسک پر آ بیٹھی۔

کیا وہ اسی طرح فخر عالم کیساتھ اس لڑکی کو قبول کرتی رہے گی؟ کون تھی وہ؟ کیا لگتی تھی

فخر عالم کی؟ ادھر فخر عالم دھنک سے پیار کرتا تھا ادھر اس سے بھی مجبور تھا۔ عجیب معمہ تھا۔

اور یہ پہلی بار تھی کہ اس نے فخر عالم سے قطع تعلق کا نہیں سوچا۔ شاید اسے فخر عالم کی محبت

کا یقین آ گیا تھا! شاید وہ جان گئی تھی کہ اس لڑکی سے اسکا جو بھی رشتہ تھا دھنک کے پیار سے

زیادہ نہیں تھا؟ مگر۔

لاٹ دن رات اکٹھے گزارنا؟

وہ کب تک ہے گی یہ آگ؟

دن آہستہ آہستہ سرک رہے تھے۔ دس بارہ دن ہو چکے تھے فخر عالم کو گئے۔ ابھی تک شاید

دو اپس نہیں آیا تھا۔ اس نے بھی جانتے سے اس سے پوچھا نہیں تھا کہ وہ کب لوٹے گا؟

آج وہ قدرے دیر سے دفتر پہنچی۔

”تمہارا فون تھا۔ وہی صاحب لگ رہے تھے اس دن والے۔ فرماتے تھے تھوڑی دیر

کی کوشش نہ کریں۔“ اور۔ دھنک نے اسے خشکیوں نظروں سے گھورتے ہوئے گہری سانس لی۔

مقامی ہسپتال میں دی وی آئی پی روم میں وہ روم نمبر ۱۲ میں ایڈمنٹ تھا۔ دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے خیال آیا وہ لڑکی بھی وہاں ہو سکتی تھی۔
”بس۔“ فخر عالم کی آواز آئی۔

”سفید خوبصورت پھولوں کی Bouquet لئے وہ اندر داخل ہوئی۔

کوئی نہیں تھا کمرے میں۔ بس فخر عالم تھا۔ کمزور چہرہ، نقابہت لئے آنکھیں۔

Bouquet اسکے ہاتھ سے لیکر فخر عالم نے اسے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے اپنے قریب

بیڈ پر بٹھالیا۔

”کب سے ایڈمنٹ ہیں یہاں۔“ دھنک کی خوبصورت آنکھوں میں قوس و قزح کے رنگ ڈولنے لگے۔ کنارے بھیگ گئے۔

”آج چوتھا دن ہے۔“

”اور مجھے آج بتایا۔“

”میں فون کرنے کے قابل نہیں تھا۔ پھر اتنے لوگ آتے رہے۔ میں نہیں چاہتا تھا تمہیں دیکھ کر کوئی غلا سوچے، سیکنڈ لڑنیں۔ یقین کرو تم ہر لمحہ دل میں رہیں۔ کل سوچا ماما سے کہوں تمہیں بتا دیں۔ پھر سوچا پتہ نہیں کس طریقے سے بتا دیں اور تم گھبرا جاؤ...“
”اب کیسی طبیعت ہے؟“ وہ اسکے ماتھے اور ہاتھوں پر بندھی بنیوں کو دیکھ رہی تھی۔
”کیسے ہوا یہ حادثہ؟“

”معلوم نہیں۔“ وہ جیسے کچھ سوچنے لگا۔ ”مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔ بس اتنا یاد ہے کوئی سکیمیر میرے پاس سے گزرتے ہوئے اتنے زور سے مجھ سے لکرایا کہ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑھکتا چلا گیا۔ پھر۔ کوئی ہوش نہیں رہا۔ بعد میں ٹیم کے لوگوں نے بتایا کہ وہ

فحص لباس تو سکیمیر کا ہی پہنے تھا مگر ٹیم میں شامل نہیں تھا کوئی اجنبی تھا۔ اور اسکے فوراً بعد کہیں تائب ہو گیا۔“ وہ دھیرے دھیرے بتا رہا تھا۔ ”میں اتنے شوق سے گیا تھا۔ سکیمپنگ میں میری جان ہے۔ مگر چلو... رہنے دو۔ تم بتاؤ کیسی رہیں اتنے دن ہاں۔“

”ٹھیک۔ آپ بتا کر بھی نہیں گئے تھے کہ کب واپس آئیے۔“

”سوری۔ مجھے واقعی خیال نہیں رہا تھا۔ تم ہی پوچھ لیتیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”سوری۔ مجھے واقعی خیال نہیں رہا تھا۔ آپ ہی بتا دیتے۔“ وہ بھی مسکرائی تھی۔

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

”اس بوتل میں سے دو گولیاں دینا ذرا پلیز!“ فخر عالم نے قرعہ میز رکھی کئی دوائیوں میں

ایک چھوٹی سی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

دھنک اٹھی۔ اس بوتل میں سے دو گولیاں نکال لیں۔ سفید رنگ کی چھوٹی چھوٹی گولیاں

تھیں۔ پھر قہر مس میں سے گلاس میں پانی اٹھایا۔ اسکے پاس آئی، آہستگی سے اس کے سر ہانے بیٹھتے ہوئے اسکے سر کو سہارا دیکر قدرے اوپر کیا اور گولیاں دیتے ہوئے پانی کا گلاس اسکے منہ

سے لگا دیا۔

اسے یہ سب کرتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جبکہ فخر عالم تھا کہ جیسے دونوں جہان کی

خوشیاں اکٹھی مل گئی تھیں ساری۔

گولیاں لیکر اس نے اپنا سر دھنک کی گود میں رکھ دیا۔

”اسی طرح بیٹھی رہو دھنک پلیز!“ وہ اسکا ہاتھ ہونٹوں سے لگائے تھا۔ ”مجھے دنوں

بعد سکون مل رہا ہے۔ یہیں رہو پلیز! کہیں مت جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ...“

دھنک آہستہ سے جھکی۔ ہولے سے اپنے ہونٹ اسکے ہٹی لگے ماتھے پر رکھ دیئے۔ چپکے

سے کچھ بھی بولے بغیر۔

”بولو۔“ وہوگی نامیرے پاس۔ ”وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ نشلی نیم وا آنکھوں

۔

وہاں کوئی دزیر نہیں آیا۔ پھولوں کے ان گنت گلدستے البتہ سامنے کی چوڑی گھڑکی میں لگے تھے۔ شاید اسکے آنے سے قبل اسے پوچھنے والے لوگ آئے تھے۔ یا شاید کل شام آنے والے لوگ لیکر آئے تھے۔

”اب چلوں۔“ گواسکا دل اسے اکیلا چھوڑنے کو نہیں کر رہا تھا۔
 فخر عالم نے گھڑکی دیکھی۔ بارہ بج چکے تھے۔ اس وقت کوئی نہ کوئی ضرور آتا تھا۔ میرا
 کھانا لیکر یا پھر ماما اپنا سٹیشنل سوپ لیکر۔

”ٹھیک ہے۔ ویسے آج شام مجھے ڈسچارج کر رہے ہیں۔ مگر جاؤ گا انشاء اللہ۔ وہاں
 آنا پھر۔“

”ادکے۔ ٹیک کئیر۔“ وہ چلنے لگی۔

”ہائے۔“ وہ بولا۔

اور دھنک آہستہ سے دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گئی۔

وہ گڑبڑ اسی گئی۔ پھر خود کو سنبھالا۔

”ایسا کوئی قانون میری نظروں سے نہیں گزرا جس کے تحت ایک لڑکی کسی لڑکے کیساتھ

اکٹھی رہ سکے۔“ اس نے اسے چھیڑا۔

”اگر ہم دونوں شادی کر لیں پھر تو رہ سکتے ہیں نا۔“

”آپ... تمہوڑا سنا پانی اور پی لیں۔ بکنے لگے ہیں آپ۔“ اس نے قریب ہی رکے

تھرمس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

فخر عالم نے اسکا ہاتھ وہیں روک دیا۔ اس کی گود میں اب بھی سر رکھے تھا۔

”بس ایسے ہی بیٹھی رہو۔ بلنا نہیں۔“

”اور... اور کہیں وہ لڑکی آگئی تو؟“ دھنک کو خندہ ضرور تھا۔

”آگئی تو آگئی۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”کیا جواب دینگے اسے۔“

”کہہ دوں گا میں اس سے شادی کر نیوالا ہوں۔“

”ہوں؟“ وہ مسکرا دی۔

”ہاں۔ دیکھ لیتا۔“ وہ دھنک کی طرف دیکھنے لگا۔ ”تمہیں پتہ ہے ماما کا اب بھی وہی

خیال ہے کہ جس آدمی نے مجھے دھکا دیا تھا وہ فریدہ کا ہی آدمی تھا۔“

”کیوں؟ اس سے فریدہ کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟“

فخر عالم نے ایک گہری سانس لی۔

”یہ باتیں اتنی زیادہ اور اتنی لمبی ہیں کہ... اور پھر میرے سر میں کچھ ہونے لگتا ہے یہ

سب دہراتے ہوئے۔“ اسکے پرکشش نقوش اب بھی سایوں کی زد میں آگئے۔

”رہنے دیں۔ اور باتیں کرتے ہیں۔“

”ہاں پلیز!“ اس نے جیسے نجات کی سانس لی۔

وہ کافی دیر وہاں فخر عالم کے پاس رہی اسکی دلجوئی کرتی رہی۔ تسلی دیتی رہی۔ اس دوران

”ہیلو“۔ وہ دھیرے سے بولی۔

اور۔ اتنے میں ماما طوفان باد و باران کی طرح اندر داخل ہوئیں۔

”اے بیٹی۔ میرے بچے کو سنبھال۔ مار دے گی کسی دن وہ کبھت لڑکی۔ ہاتھ ملتے رہ جائینگے ہم سب۔ پہلے جیب کی بریکیں لٹل کروائیں۔ پھر موٹی سکلچنگ میں دھکا دیکر ماما چاہا۔ اور یہ تھا کہ یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اب دیکھو...“ انہوں نے دروائی کی ایک چھوٹی سی شیشی اسے دکھائی۔ ”رات میں فخر عالم بیٹے کے ڈریسنگ روم میں دھوبی سے آئے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی کہ یہ آن دمکل۔ میں باہر نہیں آئی زہر لگتی ہے مجھے۔ بے حیاؤں کی طرح چومتی چاٹتی رہتی ہے میرے بچے کو۔ کافی دیر گزر گئی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

میں نے آہستہ سے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ یہ چلی گئی ہو تو میں نکل آؤں مگر توپہ کر دیا ایک بار آ کر وہ جانے کا نام کب لیتی ہے۔ فخر عالم لیٹا تھا اسکی طرف پیٹھ تھی اور آنکھیں موندی ہوئیں۔ فریڈہ کی طرف دیکھا تو جیسے اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اسی شیشی کی اصلی گولیاں ہتھیلی پر نکال فٹ سے دوسرے ہاتھ میں پکڑی گولیاں بھر دیں۔ میں نے یہ شیشی اچھی طرح ذہن نشین کر لی۔ اور دھڑکتے دل سے پچھلے دروازے سے ہاتھ روم کے راستے باہر نکل گئی۔ ذہن اسی طرف لگا تھا۔

جوں ہی وہ گئی۔ میں نے آ کر بوتل اپنے قبضے میں کر لی۔ فخر عالم اصلی دو اسر شام لے چکا تھا۔ اب اسکی ضرورت نہ تھی۔ میں اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ رات کو اسے کچھ نہ بتایا کہ پریشان ہوگا۔ صبح فخر عالم کو شیشی دکھائی، بات بتائی۔ تب سے حیران پریشان ہے۔ بہت مکار لڑکی ہے۔ گولیاں ہو بہو اسی طرح ہیں جیسے پہلے تھیں۔ چھوٹی چھوٹی سفید۔ فرق پتہ ہی نہیں چلتا۔ مگر بدلی تو میرے سامنے ہی ہیں۔ ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ دکھاؤ گی... بیٹی میں بہت پریشان ہوں۔

پہلے ماں نہ رہی بڑے صاحب اور میں نے ہی پالا پوسا۔ پھر سوتلی ماں آئی۔ سوتلی ماں کا سلوک اسکے ساتھ بس دکھاوا ہی تھا۔ مگر یہ کونسا بار تھا اس پر۔ جلد ہی بڑے صاحب نے اسے

دھنک اسے روز صبح ہی صبح آفس جانے سے پہلے دیکھنے جایا کرتی تھی اور۔ فخر عالم کو جیسے زندگی بخش جاتی تھی۔

فخر عالم اب بھی دوائیں لے رہا تھا۔ اب پہلے سے خاصا بہتر تھا۔ گھر میں ادھر ادھر گھوم پھر بھی لیتا تھا۔ آفس یا پھر اپنی کسی لیکچری وغیرہ پر البتہ ابھی تک نہیں گیا تھا۔

دن گزر رہے تھے۔ دھنک کیلئے دن خوبصورت اور راتیں حسین سنے لیکر آتیں۔ گودل میں اب بھی کانٹا سا چھار ہتا تھا۔ غلش اسے بے قرار رکھتی۔ فریڈہ کا اب بھی فخر عالم کے پاس آنا جانا تھا باقاعدگی سے۔ اب تو دھنک نے اسکا ذکر تک چھوڑ دیا تھا فخر عالم کے سامنے۔ کہ نتیجہ کچھ نہ لگتا تھا۔ یا تو وہ خاموشی سے اسے تکتا رہتا سپاٹ چہرے سے، جذبات سے عاری نظروں سے یا پھر مبہمی مسکراہٹ مدھری مسکان سے موضوع ہی بدل دیتا۔

کبھی اسکے متعلق کمل کربات نہیں کی تھی۔ چپ سا دھر رکھی تھی۔

آج وہ حسب سابق صبح صبح اسے دیکھنے گئی تو کچھ خاموشی کھلبلی چلی تھی گھر میں۔

چپ چپ سا ہنگامہ پاتا تھا، باد باسا طوفان۔

فخر عالم کے بیڈ روم پر دھنک دیکر وہ آہستہ سے اندر چلی آئی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ فخر عالم شاید ہاتھ روم یا پھر ڈریسنگ روم میں تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس لگے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

تجھی ٹائیٹ سوٹ پر قیمتی گاؤن پہنے وہ ڈریسنگ روم سے بیڈ روم میں آ گیا۔

”گڈ مورنگ نیم“۔ فخر عالم جیسے پریشان تھا۔ مگر بلاش بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاس آکر اس کے مقابل والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

خاموش تھا۔ اور وہ فخر عالم کی زندگی کی درپے تھی۔ وہ واقعی کتنا تھا تھا۔ کتنا اکیلا!
اسے یاد آیا اسی بوتل سے اس نے دو سفید چھوٹی چھوٹی گولیاں ہوسپتال میں فخر عالم کو
کھلائی تھیں۔

اس نے بوتل ماما سے لی، کھولی۔ گولیاں واقعی اسی طرح تھیں۔ مگر۔ بدلی کیوں گئیں؟
"ماما۔ ہم دونوں کیلئے ناشتہ۔" فخر عالم کو اس موضوع سے جیسے تکلیف ہو رہی تھی۔
"ابھی بھجواتی ہوں میرا بیٹا۔" اور ماما چل دیں۔

دھنک نے نظریں اٹھا کر فخر عالم کو دیکھا۔ فخر عالم اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
پرکشش نقوش سایوں کی زد میں تھے۔ دہشتیں آنکھیں فکر مند اور مبہم ہی مسکراہٹ پریشان
تھی۔

دھنک بھی اپ سیٹ نظر آنے لگی۔
دونوں ہی خاموش تھے۔ جیسے کہنے سننے کو کوئی بات ہی نہ تھی۔
پھر ناشتہ آ گیا۔

دھنک دھیرے دھیرے جوس پیتی رہی۔
اور فخر عالم اپنا گلاس بڑے بڑے گھونٹ لے کر ختم کر گیا۔
اب وہ سب کھا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے سامنے بیٹھی دھنک کو بغور دیکھ رہا تھا۔
اس وقت اسکے پرکشش نقوش سایوں کی زد میں نہیں تھے، دہشتیں آنکھیں فکر مند نہ رہی
تھیں اور مبہم ہی مسکراہٹ بھی پریشان نہ رہی تھی بلکہ۔

وہ تو اسے شوخ مسکراہٹ اور شریر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
دھنک کی نظریں اٹھیں۔ اس کی نظروں سے ملیں۔ اور۔
چلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

وہ واقعی کبھی کبھی اسکی نظروں کا سامنا نہ کر پاتی تھی۔
"کیا بات ہے"۔ وہ ہولے سے بولا۔

پڑھائی کیلئے باہر بھیج دیا تھا۔ اب تو جو ہوتا تھا چھوٹی بیگم صاحب، اسکے بھائی اور بہن کی
مرضی سے ہوتا تھا۔ سمینہ جوان ہوئی ہی تھی کہ چھوٹی بیگم صاحب نے اپنے بیٹے سے اگلی
منگنی کروادی۔ ساتھ ہی فخر عالم کا فون پر اپنی اس بھانجی فریدہ سے نکاح پڑھوادیا۔ تاکہ دولت
باہر جائے ہی نہیں۔ مگر میں چھوٹی بکتی رہتی تھی۔ انہی دنوں چھوٹی بیگم صاحب فوت ہو گئیں۔
مگر اسکے بھائی بہن دہناتے پھرتے تھے مگر میں۔

پھر ایک دن اچانک بھلے چنگے بڑے صاحب انتقال کر گئے۔ لورویں ہمارے خانسامان
کا کہنا ہے کہ انہیں زہر دیکر مارا گیا تھا۔ فخر عالم امتحان مکمل کر کے گھر لوٹا تو دوسرا حملہ اس پر
ہوا۔ مگر جیسا بوزگے ویسا کالوگے۔ اسکی نعلی میں سمینہ بی بی چلی گئی۔

تمہیں پتہ ہے کبھی اسکی جیب کی بریکیں ٹیل ہوئیں تو کبھی اسے سکینک میں گرایا گیا۔
ان سب کا مطلب میرے بچے کو ختم کرنا تھا۔ مگر اسے میری بات کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ چھوٹی
بیگم صاحب بیٹے کو جینی دیکر دولت جائیداد بیٹے کو دینا چاہتی تھیں اور اسی طرح اس موٹی فریدہ
کو فخر عالم سے باغداد کر باقی کی جائیداد بھی محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔

سمینہ بی بی کو تو اپنا ناموں زاد پسند تھا۔ خوش تھی منگنی سے مگر فخر عالم خوش نہیں تھا۔ اسے
اس قماش کی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ اس نے بار بار مجھ سے کہا چھوٹی امی نے مجھے کہاں پھنسا
دیا ہے۔ فریدہ بہت تیز و طرار لڑکی ہے۔ اسکے علاوہ اور لڑکوں کیساتھ بھی آزادی سے گھومتی
پھرتی ہے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اسے فخر عالم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسکے دشمنوں کو ختم
کر کے مال ہتھیانا چاہتی ہے۔ اور شادی پھر اپنی مرضی سے کہیں اور کر لے گی۔ مگر دولت
چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ کچھ جائیداد اسکے حق مہر میں لکھی گئی ہاتی ویسے بطور منکوحہ مل
جاتی۔ کیونکہ فخر عالم کا اب اسکے سوا اور کوئی نزدیک اور حقدار رشتہ دار نہیں..."

ماما کہتی گئیں اور۔

دھنک کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔

اس پر آج تمام انکشافات ہو گئے۔ فریدہ، فخر عالم کی کزن تھی، منکوحہ تھی۔ اسلئے وہ

خاموش تھا۔ اور وہ فخر عالم کی زندگی کی درپے تھی۔ وہ واقعی کتنا سجا تھا۔ کتنا اکیلا!
اسے یاد آیا اسی بوتل سے اس نے دو سفید چھوٹی چھوٹی گولیاں ہو سہل میں فخر عالم کو
کھلائی تھیں۔

اس نے بوتل ماما سے لی، کھولی۔ گولیاں واقعی اسی طرح تھیں۔ مگر۔ بدلی کیوں گئیں؟
"ماما۔ ہم دونوں کیلئے ناشتہ۔" فخر عالم کو اس موضوع سے جیسے تکلیف ہو رہی تھی۔
"ابھی بھجواتی ہوں میرا بیٹا۔" اور ماما چل دیں۔

دھنک نے نظریں اٹھا کر فخر عالم کو دیکھا۔ فخر عالم اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
پرکشش نقوش سایوں کی زد میں تھے۔ دانتیں آنکھیں مگر مند اور ہمہ ہی مسکراہٹ پریشان
تھی۔

دھنک بھی اپنی سیٹ نظر آنے لگی۔

دونوں ہی خاموش تھے۔ جیسے کہنے سننے کو کوئی بات ہی نہ تھی۔
پھر ناشتہ آ گیا۔

دھنک دھیرے دھیرے جوں جیتی رہی۔

اور فخر عالم اپنا گلاس بڑے بڑے گھونٹ لے کر ختم کر گیا۔

اب وہ سب کھا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے سامنے ٹیبلٹی دھنک کو بخور دیکھ رہا تھا۔

اس وقت اسکے پرکشش نقوش سایوں کی زد میں نہیں تھے، دانتیں آنکھیں مگر مند نہ رہی

تھیں اور ہمہ ہی مسکراہٹ بھی پریشان نہ رہی تھی بلکہ۔

وہ تو اسے شوخ مسکراہٹ اور شریر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

دھنک کی نظریں اٹھیں۔ اس کی نظروں سے ملیں۔ اور۔

چلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

وہ واقعی کبھی کبھی اسکی نظروں کا سامنا نہ کر پاتی تھی۔

"کیا بات ہے"۔ وہ ہولے سے بولا۔

پڑھتی تھی باہر بھیج دیا تھا۔ اب تو ہم ہوتا تھا مہوئی نیکم صاحب، اسکے بھائی اور بہن کی
مرضی سے بیٹا تھا۔ سید جوان ہوئی ہی تھی کہ مہوئی نیکم صاحب نے اپنے بھتیجے سے اسکی
منگنی کرادی۔ ساتھ ہی فخر عالم کا فون پر اپنی اس بھانجی فریدہ سے نکاح پڑھا دیا۔ تاکہ دولت
باہر جائے ہی نہیں۔ مگر میں کھڑی پکتی رہتی تھی۔ انہی دنوں مہوئی نیکم صاحب فوت ہو گئیں۔
مگر اسکے بھائی بہن دند ناتے پھرتے تھے مگر میں۔

پھر ایک دن اچانک بھلے چنگے بڑے صاحب انتقال کر گئے۔ اور دین ہمارے خانہ ماں
کا کہنا ہے کہ انہیں زہر دیکر مارا گیا تھا۔ فخر عالم امتحان مکمل کر کے گھر لوٹا تو دوسرا حملہ اس پر
ہوا۔ مگر جیسا بڑے دیبا کا لوگے۔ اسکی غلطی میں سید بی بی چلی گئی۔

تھیں پتہ ہے کبھی اسکی جیب کی بریکیں لیل ہوئیں تو کبھی اسے سکینک میں گرایا گیا۔
ان سب کا مطلب میرے بچے کو ختم کرنا تھا۔ مگر اسے میری بات کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ مہوئی
نیکم صاحب بھتیجے کو بیٹی دیکر دولت جائیداد بھتیجے کو دینا چاہتی تھیں اور اسی طرح اس موئی فریدہ
کو فخر عالم سے بائندہ کر پاتی کی جائیداد بھی محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔

سید بی بی کو تو اپنا ماموں زاد پسند تھا۔ خوش تھی منگنی سے مگر فخر عالم خوش نہیں تھا۔ اسے
اس تلاش کی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ اس نے بار بار مجھ سے کہا مہوئی امی نے مجھے کہاں پھنسا
دیا ہے۔ فریدہ بہت تیز و طرار لڑکی ہے۔ اسکے علاوہ اور لڑکوں کیساتھ بھی آزادی سے گھومتی
پھرتی ہے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اسے فخر عالم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسکے دشمنوں کو ختم
کر کے مال ہتھیانا چاہتی ہے۔ اور شادی پھر اپنی مرضی سے کہیں اور کر لے گی۔ مگر دولت
چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ کچھ جائیداد اسکے حق مہر میں لکھی گئی ہوتی ویسے بطور منکوحہ مل
جائے گی۔ کیونکہ فخر عالم کا اب اسکے موالد کوئی نزدیک اور حقدار رشتہ دار نہیں..."

ماما کہتی گئیں اور۔

دھنک کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔

اس پر آج تمام انکشافات ہو گئے۔ فریدہ، فخر عالم کی کزن تھی، منکوحہ تھی۔ اسلئے وہ

”صرف اسلئے کہ تم پریشان نہ ہو۔ اور مجھ پر یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر تمہیں بتا دیا تو یہ نہ ہو کہ مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔ کیونکہ ایک شادی شدہ مرد میں تمہارے لئے کیا Attraction ہوتی؟“

وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

”آپ اوپر سے جتنے مصوم لگتے ہیں اتنے ہیں نہیں۔“ اس نے فخر عالم کو چھیڑا۔
”کیا مطلب؟“

”یہی کہ۔ اگر میرے کانوں میں بھنگ بھی پڑ جاتی آپ کے شادی شدہ ہونے کی تو میں آپ کے راستے میں ہرگز نہ آتی۔ کبھی بھی نہیں۔ اول تو اسلئے کہ میرا پیارا اتنا خود غرض نہیں۔ دوسرے یہ کہ مجھے دوسرے کا جھوٹا کبھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔“
”ہوں؟“

”ہاں۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”آجکل وہ بڑا زور دے رہی ہے رخصتی پر۔“

”تو کر لیں۔“

”کر لوں۔“ وہ بغور اسکی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ جہاں سایہ سالہرا گیا تھا۔ دھند سی چھا

گئی تھی۔

”ہاں۔“

”کر لوں؟“

”ہاں۔“ اور ساتھ ہی آنکھوں میں چھائی دھند نم ہو گئی۔

فخر عالم نے گہری سانس لی۔ پھر مسکرا دیا۔

اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ دیکھ بھال کر میں کیسے ایک دشمن کو گھرا سکتا ہوں۔“

”اگر آپ کو ان گونیوں کی تبدیلی کا پتہ نہ چلتا تو آپ کر لیتے رخصتی۔“

وہ تو کافی عرصے سے اسکے پیار کا دعویٰ کرتا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے اوپر دیکھا ہی نہیں۔

”تم شرماتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔“

”میں نہیں شرماتی۔“ اور ساتھ ہی اسکا چہرہ کانوں کی لوڈوں تک سرخ ہو گیا۔

بڑے دنوں بعد فخر عالم کھل کر ہنس دیا۔

”اگر تمہاری ہاں ہوتی ہے۔“ وہ ٹوسٹ پر شہد لگا رہا تھا۔

”آپ ناشتہ نہیں کریں گے؟“

”کرتورہا ہوں۔“ اس نے چھری پلیٹ میں رکھ دی۔

وہ لاجواب ہو گئی۔

”تمہاری گرتی اٹھتی پلکیں مجھے سب بتا دیتی ہیں۔“ وہ پھر بولا۔

”کیا سب بتا دیتی ہیں۔“ وہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

”کہ تم کو ہم سے پیار ہے۔“

”آپ کو نہیں ہے؟“

”اتنا کہ۔ گھبرا جاؤ گی سکر۔۔۔“

اسکی سیاہ خنجر پلکیں ایک بار پھر جھک گئیں۔

”وہ بے بعض وقت مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے مجھے پریس والے کبھی اچھے نہیں

لگے۔ ایک رپورٹر کیسے اچھی لگنے لگی اور وہ بھی ایسی جو چھپ کر میرا تعاقب کر رہی تھی۔“

”مجھے بھی آپ کے طبقے کے لوگ کبھی اچھے نہیں لگے۔ انکا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہوتا ہے۔“

”تمہیں میرے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نظر آیا۔“

”ہاں۔“

”کیا؟“

”نہی کہ پیار میں ایک دوسرے سے کچھ چھپایا نہیں جاتا اور پھر آپ نے آج تک مجھ

سے اپنا لگاؤ چھپائے رکھا۔“

وہ بھی لان میں ایک چمیر پر بیٹھ گیا۔ مگر۔
اب بھی تانوں بانوں میں الجھتا تھا۔ ادویہ بن میں مصروف تھا۔

”آں۔۔۔ نہیں۔ اول تو اسلئے کہ وہ بہت ایڈوانس، انٹرایڈوانس ہے۔ اور مجھے عورت کی بے جا آزادی بالکل پسند نہیں۔ دوسرے یہ کہ میری شروع دن سے اس سے... وہ بات نہیں بنی۔ which is called love. I tried so but۔ شاید محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ پھر تمہیں دیکھا۔ باوجود تم پر غصہ ہونے کے تمہاری طرف کھینچتا چلا گیا۔ تو سمجھا یہی پیار ہے۔ پھر جیسے زندگی کو مرکز حاصل کیا۔ مگر۔ اسکے باوجود میری خوشیاں ادھوری ادھوری ہی تھیں۔ اس طرف فریدہ مائے وائف۔ اس طرف تم میری محبت۔ کس کو چھوڑوں کس کو لوں؟ سارا وقت شش و پنج میں رہتا تھا۔ وہ میری ہی جان کے درپے ہوگی یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا...“ اپنے کپ سے چائے پیتا وہ دھمے لہجے میں کہتا گیا۔

تبھی ملازم نے فخر عالم کے فیل ڈاکٹر کے پہنچ جانے کی اطلاع دی۔

دھنک چائے پی چکی تھی۔ آفس کو دیر ہو رہی تھی۔ اس نے اجازت چاہی۔

اور۔ ڈاکٹر ملازم کی ہمراہی میں اندر داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر نے گولیوں کی بوتل اپنے قبضے میں لے لی۔ تاکہ مکمل جانچ کی جائے۔ گولیاں بہر حال وہ نہیں تھیں جو فخر عالم کو ہدایت کی گئی تھیں۔ بوتل پر دوئی کا نام کچھ اور تھا اور گولیاں کچھ اور۔ صحیح فیصلہ تو اس وقت دیا جاتا جب لیبارٹری میں گولیاں ٹسٹ کی جاتیں لیکن۔

یہ بات مکمل کر سامنے آگئی تھی کہ فخر عالم کی زندگی کو اصل گولیوں کی بجائے یہ گولیاں کھلا کر نقصان پہنچانا بہر حال مقصود تھا!

ڈاکٹر بھی خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ فخر عالم کیساتھ چائے کا ایک کپ پی کر وہ بھی رخصت ہو گیا۔

فخر عالم اٹھا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ تیار ہوا اور باہر لان میں آ گیا۔

تھوڑی دیر وہ یوں ہی بلا مقصد سائیڈ واکس پر چلتا رہا۔ بھنی بھنی خوشبو بکھیرتے موسیٰ پھول بہت دلکش لگ رہے تھے۔ کوبالٹ بلوشٹاف آسمان پر تیرتا سفید بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ گلابی جاڑے کی نرم و گداز دھوپ جسموں کو حرارت بخش رہی تھی۔

اسے اچانک ہی یہ سب نیند کا ایک جھونکا لگا۔ جیسے فخر عالم کوئی خواب تھا، سپنا تھا اور وہ جاگ گئی تھی۔ خواب بکھر گئے تھے اور سینے ٹوٹ گئے تھے!

وہ شادی شدہ تھا۔ اس کے گھریلو مسائل بہت وسیع تھے، تنازعات بہت الجھے ہوئے! اسے ان وسیع گیموں میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ ان معاملات سے دور رہنا چاہیے تھا۔ کوئی بھی خیر خواہ اسے یہی مشورہ دیتا۔

وہ اس دن کو کوٹھنے لگی جس دن وہ اسکا انٹرویو لینے گھر سے نکلی تھی۔ انکل اشفاق کے منع کرنے کے باوجود آصف کی مرضی کے خلاف! اور پھر۔۔۔ اچانک اسکا دل چاہا یہاں سے دور چلی جائے۔ سب چھوڑ چھاڑ کر، سارے بندھن توڑ کر!

کہ اسکا سر پھٹا جا رہا تھا۔ وجود بڑھتا جا رہا تھا۔

پھر یکدم ہی اسے خیال آیا۔

کیوں نہ انکل اشفاق سے کہہ کر لمبی چھٹی لے لے؟ گھر جا کر اپنے والدین اور بہنوں

میں اطمینان سے چند دن رہے۔ اپنے تھکے ذہن کو سکون مہیا کرے!

واقعی۔۔۔ یہی ٹھیک تھا۔ نہ فخر عالم ہوتا، نہ اسکا شہر، نہ اس سے لڑ بھڑ کا خدشا!

اور پھر۔۔۔ اچانک ہی اسے لے لے فاصلے نظر آئے اپنے اور فخر عالم کے درمیان۔ ناقابل

عبور دوریاں در آتی نظر آئیں اپنے اور اسکے بیچ!

گھر میں کچھ تو سکون میسر آتا!

یہی سوچ کر وہ۔۔۔ اٹھ کر کچن میں چلی گئی شام کی چائے بنانے۔ فرزانہ سو رہی تھی۔ آج

وہ ہی چائے بنا کر اسے پلاتی تو اچھا تھا۔

اسکے سر پر کا گراں بار بھی کچھ کم ہونے لگا۔ لڑکھڑاتا وجود اپنے بس میں آنے لگا۔

چائے بناتے بناتے اس نے فیصلہ پختہ کر لیا۔

فرزانہ کیساتھ چائے پیتے ہوئے وہ خاصا ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

آفس کی ہماہمی میں دھنک نے صبح تک کی ہر بات پس پشت ڈال دی۔ آج خاصا کام تھا دفتر میں۔ اور اسے کچھ دن سے دی ہوئی اسائنمنٹ کی تکمیل پر چیف رپورٹرنے خاص طور سے زور دیا تھا۔ آج اسے بہر حال مکمل ہو جانا چاہیے تھا۔ اسی میں لگی رہی سارا وقت۔ آخر دوپہر تک کام ہو ہی گیا۔ ایک نظر ثانی ڈال کر اس نے اسائنمنٹ چیف رپورٹرنے کے حوالے کی۔ اور۔۔۔ گھر چلی آئی۔

کھانا کھا کر جو بستر میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹی۔ تو ذہن فخر عالم کی طرف پلٹا۔ فخر عالم کے ذاتی مسائل کی طرف منتقل ہوا اور۔۔۔

وہ تھک سی گئی۔ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور پھر جیسے قدم لڑکھڑانے لگے۔

فخر عالم کو پانا۔۔۔ بہت بڑا آرتھ۔ سننے میں بڑا دلکش، دیکھنے میں بہت خوبصورت پر۔

عملاً بہت مشکل، بلکہ ناممکن سا لگ رہا تھا۔

فخر عالم کا نکاح ہو چکا تھا۔ اسکی منکوحہ بسا اوقات اسکے پاس آتی جاتی قیام کرتی۔ رخصتی

کا کیا تھا، محض ایک دکھاوا؟ اب کیا فخر عالم اس سے چھٹکارا حاصل کرتا؟ اور فخر عالم فریاد کیوں

اسے چھوڑتی؟ پھر کیا کورٹ پکھریاں؟ نہیں۔۔۔

دھنک کو یہ سب بے حد مشکل لگا۔ اور پھر فخر عالم کا فریاد سے نفرت کرنے میں کچھ ہاتھ

دھنک کا بھی تھا۔ فخر عالم اس سے نہ ملتا تو شاید وہ فریاد کو چھوڑنے کا بھی نہ سوچتا۔ اسے اور بھی

برا لگا۔ اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا۔

وہ۔۔۔ الجھ الجھ گئی۔ جیسے اچانک اس کے ارد گرد جال بن دیئے گئے تھے۔ اور وہ ان

میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ جیسے یکدم ہی کہیں بھول بھلیوں میں کھو کر اپنا راستہ بھول گئی تھی۔

دنوں بعد وہ فرزانہ کیساتھ ڈاکٹر ماریا کے فلیٹ میں گئی۔ دیر تک تینوں گپ شپ کرتی رہیں۔ وہاں سے نکلیں تو دونوں ڈز کیلئے قریبی ریسٹورنٹ میں گئیں۔ سوپ، پیا، برگر کھائے۔ اس وقت وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

رات سونے کیلئے بستر پر لیٹی تو فوراً نیند آگئی۔ فخر عالم کے باپ کو زبردیگر مارا گیا تھا، سمیٹہ کو قتل کیا گیا تھا، فخر عالم نے رات سوتے وقت وہی گولیاں کھالی تھیں اور صبح بستر میں مرا ہوا پایا گیا۔ تینوں کی لاشیں ایک کمرے میں ایک ہی قطار میں رکھی تھیں۔

خوف کے مارے وہ پسینے میں تر پڑی اور فخر عالم کو دیکھ کر بہائے آنسوؤں سے تکیا اب بھی گیلا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ کتنا بھیا تک خواب دیکھا تھا اس نے!

اٹھ کر وہ ہاتھ رو م گئی۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ اور اپنے لئے سکون کی دعا مانگی۔ چھٹی کا ارادہ پختہ کیا۔ گھر جانے کا فیصلہ پکا کر لیا۔

سکون و اطمینان اے امی ابو بہنوں اور گھر کے ماحول میں ہی مل سکتے تھے۔ ایک بل کو فخر عالم کا بھی خیال آیا۔ ایسے مشکل وقت میں وہ اسے چھوڑ کر جا رہی تھی، اسے اپنا آپ خود غرض بھی لگا مگر۔

یہ سب بھی تو اسکی برداشت سے باہر تھا۔

وہ سامنا نہیں کر سکتی تھی اتنے سارے مسائل کا!

اسکا نکاح نہ ہوا ہوتا تب بات اور تھی۔ تب وہ کسی بھی مشکل کا مقابلہ کر سکتی تھی۔

مگر اب۔۔۔ اسے اپنا آپ خود غرض بھی لگتا تھا۔ کسی اور لڑکی کی ملکیت کا انتظار کرنا کہ

کب وہ فارغ ہو اور اپنائے اسے۔

اسکی قسمت کہیں اور لکھی ہوگی۔ پہنچ جائے گی خود بخود وہاں ورنہ۔۔۔ شادی کو اس نے کبھی اتنا اہم تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے پروفیشن سے ہر چیز سے زیادہ محبت تھی۔

آج ہی اس نے چھٹی کی درخواست دی۔ اور دو پہر دو بجے کھانا کھاتے ہی فرزانہ کو الوداع کہتی گھر جانے کیلئے بس میں بیٹھ کر روانہ ہوئی۔

فخر عالم ہر صبح اسکا انتظار کرتا۔ عادت جو ڈال دی تھی دھنک نے۔ تیسرے دن مجبوراً اس نے اسکے آفس فون کیا۔ پتہ چلا چھٹی پر گئی تھی۔ اور وہ بھی مہینہ بھر کی۔

اسے سخت حیرانگی ہوئی۔ اچانک اسے چھٹی کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی اور اگر اتنی اہم جنسی تھی بھی تو اسے کسی طریقے سے بتا کر یا پیغام چھوڑ کر تو جاسکتی تھی۔

دن گزرنے لگے۔ فخر عالم آجکل دیسے بھی بہت مصروف تھا۔ ساتھ میں پریشان بھی۔ بزنس کا بھاری بھر کم بوجھ اوپر سے فریڈہ کی جھک جھک۔۔۔ بحث مباحثے!

ایسے میں اسے دھنک کی ضرورت محسوس ہوتی، اسکی تسلی کی مگر۔

وہ تو اسے عین منجھدار میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ ڈائری جس میں اسکا پتہ درج تھا وہ بھی کہیں مل نہیں رہی تھی۔

آج اس سے مزید صبر نہ ہو سکا۔ اسکے آفس فون کیا۔ خوش قسمتی سے آصف نے ریسیو کیا اور اس سے وہ بڑی آسانی سے دھنک کے گھر کا ایڈریس اور فون نمبر لینے میں کامیاب ہو گیا۔

خط لکھنے کا تو وہ شروع سے ہی چور تھا۔ فون کر دیا اس نے۔

”کچھ بتائے بغیر ہی چلی گئیں کیوں؟“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔

”میں نے ضروری نہیں سمجھا۔“ وہ روکھے سے لہجے میں بولی۔

اور۔۔۔ فخر عالم چند سیکنڈز ریسیور کو دیکھتا رہ گیا۔

”تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔“

”آپ میرا انتظار کرنا چھوڑ دیں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”کیوں؟“ وہ بے حد حیرت سے بولا۔

اسکا بجا بجا چہرہ، شہری آنکھوں میں اتری دیر اپناں۔ اسکے دکھ اور درد کی نماز تھی۔
 امی نے اکثر پوچھا بھی مگر وہ ٹال گئی۔ کیا کہتی؟

آج تو ادا سی حد سے بڑھ گئی تھی، دکھ بے پایاں اور درد سوا ہوا چلا تھا۔ جانے کیوں صبح
 ہی سے رونا رونا آ رہا تھا۔

تسلیم اور نلیم کالج گئی تھیں، امی پڑوس میں۔ وہ اکیلا بیرونی لان میں دھوپ میں چہرہ
 پر چٹھی سڈنی شیلڈن کی 'Blood Line' کے اوراق پلٹ رہی تھی۔

درختوں کی چمکیلی شاخوں پر بنی کوئلیں پھوٹ آئی تھیں۔ 'Kiss Me Quick' کے
 کانٹے دار شاخوں میں ننھے ننھے ہرے ہرے پتے نکل آئے تھے اور۔ اسکے بیڈروم کی
 کھڑکی کے قریب گئی رات کی رانی پھولوں سے لد گئی تھی۔

تجھی گیت پر کی کال بیل بج اٹھی۔
 رخ موڑتے ہوئے اس نے دیکھا۔

فریدہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہی ٹھاٹھاٹ باٹ، وہی طمطراق لئے!

متحیر سی کتاب بند کرتے ہوئے وہ پاس چلی آئی کہ۔ آخر تو وہ اسکے گھر آئی تھی!
 "ہیلو"۔ دھنک ہو لے سے بولی۔

"ہیلو"۔ وہ جیسے کاٹ کھانے کو تھی۔
 دھنک دھیرے سے مسکرائی۔

"آئیے بیٹھیے"۔ دھنک نے لان میں رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔
 "میں بیٹھی نہیں آئی"۔ وہ تیزی سے بولی۔

"پلیز! اتنی دور سے چل کر آئی ہیں... تو اپنا فرض بھاری تھی۔"
 "میں چل کر نہیں آئی گاڑی میں آئی ہوں"۔

"اوہ۔ پھر بھی بیٹھیے تو سہی"۔ اس نے اپنی مسکراہٹ دبالی۔
 "بھولی مت بنو سمجھیں"۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے غصے سے بولی۔

"آئیدہ فون مت کریں"۔ ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا کہ۔

وہ سختی نہ برتی تو وہ گھر تک آسکتا تھا اور۔ کس دل سے اس نے اتنی سختی برتی کچھ اسے
 ہی معلوم تھا۔

فخر عالم کو پہلے تو یقین نہیں آیا۔ مگر۔ ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو غصہ آ گیا۔ اتنا
 کہ وہ سامنے اسے ہوتی تو اسے جھنجھوڑا لتا۔

اسکے بعد۔ وہ پھر سے اپنی مصروفیات میں جت گیا۔ وہ فارغ تھوڑی ہوتا تھا کہ
 اس کے پیچھے مارا مارا پھرتا۔ یہ تو اسکی دھنک سے بے پناہ محبت تھی جو وہ اس کیلئے روزانہ
 اور ضرور وقت نکالتا۔ بہر حال۔

وہ پریشان ضرور تھا۔ اس بے رخی کی وجہ اسکی سمجھ سے باہر تھی۔

دو چار روز اور بھی خاموش رہا۔ اپنے اوپر قابو پائے رکھا لیکن۔
 آج پھر۔ جیسے پیار نے دل پر دھک دی۔

اس نے اسے خط لکھ ڈالا۔ وجہ پوچھی، اپنی بے قراری لکھی اور جواب کا منتظر رہا۔ لیکن۔
 اس طرف سے ہفتہ دس دن گزر جانے کے بعد بھی جواب نہ آیا۔ اسکا مطلب تھا وہ
 اسے جواب کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔ تب وہ۔ جھنجھلا اٹھا!

اپ سیٹ رہنے لگا۔ بات بے بات نوکروں پر برس پڑتا۔ بلاوجہ آفس میں ڈانٹ ڈپٹ
 کرتا۔

دھنک کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ چڑچڑی رہنے لگی۔ بات بات پر بگڑ جاتی، بے اختیار
 رونے لگتی۔

فخر عالم کو بھول جانا کتنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بے بس ہونے لگتی، بے قابو ہو جاتی۔ اکیلے
 میں اکثر رو پڑتی۔ اسی طرح ہی کچھ دل کی بھڑاس نکل جاتی۔

کچھ روز اور گزر گئے۔ بڑی مشکل سے دل کو سمجھایا تھا، اپنے پیار کو تھپک تھپک کر سلایا تھا۔

”میں آپکا مطلب نہیں سمجھی“۔ وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”بننے کی ضرورت نہیں۔ فخر عالم سے آج ہی دستبردار ہو جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

”تمہارے ساتھ اسکے نکاح کانتے ہی میں نے اسے خیر باد کہہ دیا ہے۔ مجھے بھی

دوسرے کے حصے پر قبضہ کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ اسکا میک اپ سے لٹا ہوا چہرہ مزید تھمتھا اٹھا۔

”مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں اور تاہی میں تمہارے غصے سے مرعوب ہوں۔“

دھنک کے لہجے میں بھی تیزی آگئی۔

”تم ہمارے درمیان نہ آئیں تو کبھی کی ہماری شادی ہو چکی ہوتی۔“ غصے سے اسکی

سانس تیز چل رہی تھی۔ ”تم اسکی دولت کے پیچھے ہو۔“ وہ مزید بولی۔

اور۔ دھنک سے اپنی توہین برداشت نہ ہو سکی۔

آگے بڑھ کر گیٹ کا پٹ وا کر دیا۔

”یہ راستہ باہر کو جاتا ہے۔ جن قدموں سے آئی ہو انہیں سے لوٹ جاؤ۔“

ایک ہل کو فریڈہ جیسے سکتے میں آگئی۔ اس سے قبل شاید اس نے ایسے الفاظ نہیں سنے

تھے۔ لیکن۔

دوسرے ہی لمحے خود کو سنبھالا۔

”چلتی ہوں۔ لیکن اچھی طرح سن لو جلدی ہماری شادی ہونیوالی ہے۔ اسلئے آئندہ

تمہیں اسکے ساتھ کوئی رابطہ رکھتے دیکھا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔“ دھنکی آ میز لہجے میں کہتے کہتے

وہ باہر نکل گئی۔

دھنک نے گیٹ بند کیا۔ اور تھکی تھکائی سی آ کر آرنڈ چیر پر ڈھیر ہو گئی۔

”جلد ہی ہماری شادی ہونیوالی ہے۔“ پچھلے سیسے کی طرح یہ فقرہ اسکے کانوں میں ریٹننے

لگتا۔

شاید دھنک کے آجانے کے بعد دونوں کے حالات سلجھ گئے تھے۔ شاید وہ دوواہی زہریلی

نہیں نکلی تھی اور دھنک سے مایوس ہو جانے کے بعد کہہ سن کر دونوں رخصتی پر آمادہ ہو گئے

تھے۔ ماؤف ذہن لئے وہ کرسی پر پڑی رہی۔

اور۔ آج ہی شام ایک بار پھر فخر عالم کا فون آ گیا۔

”مجھے صاف صاف بتا دو تمہارے کیا ارادے ہیں؟“

اوہ۔ تو وہ بھی آخری فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ مختصر آ بولی۔

”مجھ سے تعلق نہیں رکھنا چاہتیں؟“

رخصتی سے پہلے جیسے وہ آخری اور رکی باتیں کر رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا تھا بعد میں مجھے الزام

مت دینا۔

”یہی سمجھ لیں۔“

”کوئی خاص بات ہوئی ہے؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”بس۔۔۔ دل نہیں چاہتا۔“

”اوہ۔“ ساتھ ہی ریسیور کریڈل پر رکھنے کی آواز آئی۔

کمرے میں آ کر بستر میں گھس کر وہ دیر تک چپکے چپکے روتی رہی۔

کاش! وہ اس نے کبھی نہ ملی ہوتی۔ کاش! اسے اس کی شادی کا پتہ ہی نہ چلتا اور کاش! اوہ

آج آخری اور رکی باتیں نہ کرتا!

”کوئی نئی خبر سناؤ یہ تو پرانی ہو چکی ہوگی“۔ وہ بڑے ضبط سے بولی۔

”نئی خبر؟“

”ہاں“۔

”اچھا سوچتا ہوں۔“ ہاں۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔ ”وہ جو ہم گدا گروں پر آرٹیکل لکھ رہے تھے نا... دو چار روز پہلے میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ کسی نے اچانک کمر میں زور سے بیساکھی ماری۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی ادھیڑ عمر فقیر تھا جو انٹرویو کے دوران بھی بہت بڑھ بڑھ کر بولتا تھا۔ کہنے لگا کہیں اکیسے ٹلوگے یا نہیں سیدھا کر دوں گا...“

آصف کیساتھ ساتھ دھنک بھی ہنس دی۔

”اسی طرح ہنستی رہا کرو۔ کیا منہ لٹکائے بیٹھی تھیں صبح سے۔“

وہ پھر ہنس دی۔

”ویسے آصف تمہیں واقعی احتیاط کرنا چاہیے۔ ان سے کچھ بعید نہیں۔“

”ایسی کی تھیسی کر دوں گا ہونہ۔ ویسے مادام جرنلسٹ! ایک جرنلسٹ کو مضبوط اور مستحکم ہونا چاہیے۔ لہجے میں مضبوطی اور استحکام ہونا چاہیے۔ بلکہ بعض اوقات ضرورت پڑنے پر کراخت ہونا چاہیے۔ کیا تمہارا خیال ہے لوگ ہمیں ڈرائیں دھمکائیں اور ہم مرعوب ہو جائیں۔ سچ لکھنا چھوڑ دیں۔ جھوٹ، بلوٹ کھسوٹ اور کرپشن کی نشاندہی کرنا چھوڑ دیں۔ رشوت لینا شروع کر دیں ضمیر بیچ دیں اپنا۔ میں تو...“

”بس بس دم لیں ذرا مسٹر آصف۔“ وہ دل ہی دل میں اسکی معترف ہو رہی تھی۔

”میں تو چاہے جان جائے سچ لکھوں گا۔ جھوٹ کو بے نقاب کروں گا...“

”بھئی میں تو اس گدا گر کی بات کر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہنسی آگئی۔“ جو تم

پر بات بات پر طنز کر رہا تھا۔ تمہیں اپنے ساتھ بھیک مانگنے کی بھی دعوت دی تھی...“

”اسی نے تو اس دن بیساکھی ماری تھی۔“ وہ بھی ہنس دیا۔

”تھکے کو کمزور مت سمجھو آگے میں پڑ جائیگا۔“

پورے ایک مہینے بعد آج وہ میگزین کے آفس آئی تھی۔ بقول آصف بالکل بدلی ہوئی تھی۔ جیسے وہ دھنک کہیں کھو گئی تھی، گم ہو گئی تھی۔ یہ دھنک اور تھی، مختلف تھی بالکل۔

”اور ہاں سنو۔ سنا ہے تمہارے اس دشمن نے اپنی کزن سے شادی کر لی ہے۔“

اور۔۔۔ دھنک جیسے منوں وزن تلے دھنستی چلی گئی۔

”کب؟“ وہ بولی۔ کہ وہ نہیں چاہتی تھی آصف کچھ سمجھ جائے۔

”کچھ دن ہوئے سجاد بتا رہا تھا۔“ سجاد بھی ان کا کولیگ تھا۔ ”بلکہ مجھے تو تب اس نے بتایا تھا جب مسٹر فخر عالم سکیننگ پر گیا تھا۔ میں تمہیں بتانے لگا تھا کہ میری سکیم ٹیل ہو گئی وہ لڑکی مسٹر عالم کی کزن نکلی۔ مگر پھر تمہارا فون آ گیا اور میں بات بھول بھال گیا۔ ہاں تو سجاد کہتا تھا اس نے اپنی کزن سے سنا ہے۔ سجاد کی کزن اور مسٹر عالم کی کزن کی آپس میں کچھ جان پہچان ہے۔ مسٹر عالم کی کزن کا نام فریدہ ہے۔ اسی نے اسے بتایا ہے کہ ان دونوں کی شادی ہونوالی ہے۔ بہر حال اب تک ہو چکی ہوگی اس بات کو کچھ دن ہو گئے ہیں...“

تو۔۔۔ فریدہ سچ کہہ رہی تھی۔

اور... اور... فخر عالم نے بھی جیسے آخری اور رسمی سی گفتگو کر کے اپنا فرض پورا کر لیا تھا۔

دھنک اپنے آپکو سنبھالنے لگی۔ چہرے پر رونق لانے کی کوشش کرنے لگی۔

”تمہارے پاس ان خبروں کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے؟“ وہ بمشکل مسکرائی۔

”اور یہ کہ۔“ وہ ان سنی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مسٹر عالم کی کزن کہتی تھی کہ ان دونوں

کے درمیان ایک لڑکی آگئی تھی مگر اب وہ درمیان میں سے نکل گئی ہے۔ اب راستہ صاف

ہے اور وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔“

مگر۔ اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا اسے بھول جانے کا۔
 پر۔ کیا وہ اسے بھول پائی تھی۔ ایک ہل کو بھی؟
 کیا ہوگا؟ کیا اسکی زندگی اسی درد میں کٹے گی؟ وہ ہلکے ہلکے کر رہی۔
 فخر عالم نے اس کیساتھ فلرٹ نہیں کیا تھا۔ وہ بے وفا نہیں تھا۔ خود وہ ہی اسے چھوڑ
 کر چلی آئی تھی۔ اب بھگتا تو تھا ہی۔ وہ مزید رو دی۔
 فخر عالم اب کسی اور کا ہو چکا تھا۔ اور اس کیلئے محض ایک اجنبی تھا۔ وہ نیچے میں من
 دیکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تبھی فرزانہ آگئی۔
 ”کیا ہوا دھنک؟“ اس کے قریب بستر کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے وہ تشویش سے بولی۔
 ”کچھ نہیں۔“ وہ روتے روتے بمشکل بولی۔
 ”کسی نے آفس میں کچھ کہہ دیا ہے؟“
 ”نہیں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔
 ”پھر کیا ہوا ہے بتاؤ نا؟“ اس نے اس کا جھکا سرا پر اٹھایا۔
 رورو کر اسکی خوبصورت آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

”بس روؤ نہیں پلیز۔ آگے ہی گھر سے بجائے مہمند ہونے کے مرجھائی مرجھائی آئی ہو
 اوپر سے اس قدر رونا۔ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔ آفس میں یا پھر اس بکھیرے میں جس میں تم نے
 قدم رکھا تھا اور جس کیلئے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا... بہر حال چھوڑو
 جو ہوا سو ہوا۔ اپنے آپکو ہلکان مت کرو۔ تمہاری ضرورت اور بھی بہت سے لوگوں کو ہے...“
 فرزانہ کی باتیں سن سن کر دھنک اپنے حواسوں میں آنے لگی۔ انکھوں کی پوروں سے
 آنسو پونچھے۔ پاؤں نیچے لٹکاتے ہوئے چہل پہل اور اٹھ کر منہ دھونے باتھ روم جانے لگی۔
 ”چلو شاپس کپڑے بدل لو۔ منہ ہاتھ دھولو۔ کھانا کھاتے ہیں پھر۔“ فرزانہ نے اسے
 باتھ روم تک جانے میں مدد دی۔

”واہ۔ واہ مگر بارشاد۔“

”سچ لکھو، مضبوط رہو۔ مگر احتیاط برتنے میں کیا حرج ہے۔“
 ”تم نے احتیاط برتی تھی؟ ایک قاتل کی تلاش میں یوں بے دھڑک اکیلی چل پڑی تھیں
 جیسے... پاکستانی نہیں کوئی ویسٹرن رپورٹر ہو۔ اور...“
 اچھا خدا حافظ۔ اور میں انکل اشفاق کے پاس جا رہی ہوں۔“ وہ اس بحث تک سے
 گھبرانے لگی تھی۔ اٹھ کر چیف ایڈیٹر کے دفتر کی طرف چل دی۔
 گھر آ کر وہ اونڈھی بستر پر پڑ رہی۔

فخر عالم اس سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہو گیا تھا۔ دونوں کے راستے بالکل مخالف سمت
 نکل گئے تھے۔
 آنسوؤں کے درمیان وہ سوچتی رہی۔ کہیں اس کی طرف سے تو کوئی جھول نہیں رہ
 گیا تھا؟ پھر سوچتی اس نے تو اپنی طرف سے اچھا کیا تھا۔ فریڈہ جیسی بھی تھی، تھی تو عورت ہی۔
 اس کا حق وہ کیسی مارتی؟ ایک نکاح شدہ جوڑے کے درمیان وہ کیونکر آتی؟ اس کا ضمیر بھی تو
 گوارا نہیں کر رہا تھا۔ پھر۔ فخر عالم کے گھریلو حالات اس قدر الجھے ہوئے تھے، اس قدر پیچیدہ
 تھے کہ وہ گھبرا اٹھی تھی۔ نہیں ڈالنا چاہتی تھی ہاتھ ایسے معاملات میں۔ اور پھر۔ یہ بھی
 تو تھا کہ لوگ سمجھتے وہ اسکے دولت کے پیچھے تھی۔ یہی سب ل کر اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہے
 تھے۔

ہاں ایک پوائنٹ پر آ کر وہ خود کو ملامت سا محسوس کرتی کہ ایک ایسے لمحے میں وہ اسے
 چھوڑ کر چلی آئی کہ جس وقت وہ بہت تھکا تھا، بہت اکیلا تھا اور اسکی ضرورت محسوس کر رہا تھا!
 یہیں آ کر وہ خود کو اس کا گناہ سمجھتی۔ اسے اس کے پہلے فون کا خیال آتا۔
 ”تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔“
 ”آپ میرا انتظار کرنا چھوڑ دیں۔“ جواب میں کتنی بے حس سے بولی تھی وہ۔
 پھر اس کا خط۔ کتنی بے قراری تھی اس میں اس کیلئے۔

کے بعد تسلیم کو بھی ساتھ لیکر جانا تھا۔ لڑکا وہاں پر پڑھائی کے آخری مراحل میں تھا۔ خیال تھا تسلیم بھی یورپ گھوم آئیگی۔

خط پڑھ کر اسے خوشی ہوئی۔ پہلے امی ابوخواہ بخواہ ہر رشتہ اسکے انتظار میں واپس کر دیتے۔ اچھا کیا اب کے واپس نہیں کیا۔ اسکا نہ سہی تسلیم اور نسلیم تو اپنے گھر کی ہو جاتیں۔ وہ تو پھر بھی اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ اچھا کما رہی تھی اور مطمئن تھی۔

دھنک کیساتھ ساتھ انہوں نے فرزانہ کو بھی آنے کی دعوت دی تھی۔ وقت کم اور کام زیادہ تھے۔ امی نے دونوں کو شادی سے دو چار روز قبل آنے کو لکھا تھا۔

فرزانہ آئی تو دھنک نے اسے امی کا خط دکھایا۔

بس پھر کیا تھا۔ دونوں ماری ماری شوپنگ میں لگ گئیں۔ مہندی ہر خستی ہو لیمہ سبھی کیلئے توڑ۔ سز تیار کرنے تھے۔ بیچنگ شوز اور کیا کچھ نہیں۔

فرزانہ نے تو تسلیم کیلئے گفت بھی لینا تھا۔ گفت خرید کر وہ دونوں وہیں قریب ہی علاقے کے سب سے ڈسینٹ اور بڑی بک شال میں گھس گئیں۔ گفت پیک بھی کروانا تھا اور گفت پیکٹ کے اوپر کارڈ بھی لگانا تھا۔

فرزانہ کارڈ پسند کرنے لگی اور دھنک ادھر ادھر گھوم پھر کر ریکس میں لگی کتابوں پر نظریں دوڑانے لگی۔ اسے اچھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

تبھی۔ وہ مخصوص مدھر پر فیوم کی مہک سے چونک اٹھی۔ غیر ارادی طور پر ارد گرد دیکھنے لگی۔ پاس ہی۔ اسکے بالکل پاس کھڑا ٹر عالم بھی کتابوں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے رخ واپس پھیر لیا۔ آگے بڑھ آئی۔

کیا فخر عالم نے بھی اسے دیکھا تھا؟ کیا اس نے بھی اسکی موجودگی نوٹ کی تھی؟ مگر وہ یہ سب کیوں سوچ رہی تھی؟ اس نے شادی کر لی تھی اور دھنک نے پھلا ہر رشتہ توڑ دیا تھا۔ پھر وہ کیوں اس سے کوئی اور امید رکھتی تھی۔

وہ دکان سے باہر نکل کر فرزانہ کا انتظار کرنے لگی کہ اندر جیسے اسکا دم گھٹ رہا تھا۔ سانسیں

دن یوں ہی بے کیفی میں گزر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے پاگل من کو سمجھا پائی تھی فخر عالم اسکے نہیں کسی اور کے نصیب میں تھا۔ وہ اپنے آپ کو رسالے اور دفتر کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ مصروف رکھتی۔ آصف سے باتوں میں وقت اچھا کٹ جاتا۔

پھر آج تو وہ ایک منسٹر کی بیوی کا انٹرویو لینے بھی گئی تھی۔ اسے برا مزہ آیا۔ منسٹر تو منسٹر بیوی ڈیڑھ منسٹر تھی۔

”سنا ہے آپ بہت اچھا کھانا بنا لیتی ہیں“ اس نے واقعی کسی سے سن رکھا تھا۔

”جی نہیں۔ آپ نے بالکل غلط سنا ہے۔ میں نے کبھی اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں بنایا۔“

جواب ملا تھا۔

”منسٹر صاحب کافی بارعب شخصیت ہیں۔ آپکے ساتھ انکار وہ یہ کیسا ہوتا ہے؟“ اس نے پھر سوال کیا تھا۔

”منسٹر ہونگے وہ پبلک کیلئے۔ گھر میں میں ان پر رعب ڈالتی ہوں۔“ بیگم منسٹر بولی تھیں۔ کافی دلچسپ انٹرویو تھا۔ آفس آکر اسے مکمل کیا۔ نیٹ کیا اور ایڈیٹر کے حوالے کر کے گھر آگئی۔

فلٹ کے آگے نلکے بجن بوس پر ڈی کے خانے پر نظر پڑی۔ اس کے نام کا خط انکا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اچک لیا۔ امی کا تھا۔

اندرا آئی بیگ ایک طرف ڈالا، خط کھولا۔ باقی احوال کیساتھ یہ بھی خبر لکھی تھی کہ تسلیم کی اسی ڈاکٹر کیلئے ہاں ہو گئی جو پہلے دھنک کیلئے آیا کرتے تھے۔ بہت اچھے لوگ تھے امی کافی مطمئن لگ رہی تھیں۔ نکاح کی رسم دو ہفتے بعد قرار پائی تھی۔ لڑکا لندن سے آئیوا تھا۔ نکاح

رک رہی تھیں۔

اس وقت پھر وہ گم سم لگ رہی تھی۔ فرزانہ نے بھی نوٹ کیا۔

”کیا ہوا دھنک؟“ گھر کی طرف آتے آتے فرزانہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ افسردہ سی مسکرا دی۔ ”تمہیں تو خواہ مخواہ دہم ہو گیا ہے۔ جہاں میں

ذرا خاموش ہوئی تم سمجھیں مجھے کچھ ہو گیا ہے۔“ اسکی آواز جیسے دور سے آرہی تھی۔

”تمہیں چپ رکھ کر مجھے واقعی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ... وہ والی بات تو ختم ہو گئی؟“

اسکا اشارہ دھنک کے افسر کی طرف تھا۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”پوچھ سکتی ہوں کیوں ختم ہوا؟“

”اسلئے کہ اسکی شادی ہو گئی اور میں درمیان میں سے ہٹ آئی۔“ وہ بڑے ضبط سے بولی۔

”اچھا کیا۔ مٹی ڈالو اب اس بات پر۔ جو چیز باقی نہ رہی ہو اسکا رونا کیسا۔ چلو آؤ شوپنگ

کی چیزیں دیکھتے ہیں۔“ وہ اسکا دھیان بنانے کو مختلف چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

اور۔ یوں ہی کرتے کرتے دو ہفتے بھی گزرتے کو آگئے۔

وہ دونوں خوشی خوشی دھنک کے گھر کیلئے روانہ ہوئیں۔ اس بار انہوں نے ٹرین سے

جانے کا سوچا۔ جلدی جلدی ٹیشن پہنچیں، ٹرین میں چڑھیں، مختصر سا سامان رکھا اور کھڑکی

کے قریب جگہ لیکر بیٹھ گئیں۔

ٹرین چل پڑی۔ آبادی سے نکل کر اب وہ لہلہاتے کھیتوں اور گھنے درختوں میں سے

گزر رہی تھی۔ پھر سیاہ تاریک سرنگ آئی، قدرے چڑھائی شروع ہوئی، ساتھ ہی پائین کے

اکاد کا درخت، جھاڑیاں، لمبی لمبی گھاس۔ دور۔ بہت دور۔ اوپر۔ خوب اوپر پہاڑی سلسلے

پر چنل اور صنوبر کے درخت برف سے ڈھکے نظر آ رہے تھے۔ ٹرین یہاں نیچے سے ہی آگے

بڑھ جاتی تھی۔ یہاں سے ہی دوبارہ میل اونچائی پر آئی اور جہاں کا گھر تھا۔ ساتھ ہی فخر عالم

کا اسٹیٹ اور جنگلات!

ٹرین کی رفتار کم ہو گئی۔ اور پھر آہستہ آہستہ ٹیشن پر رک گئی۔ دونوں کیا دیکھتی ہیں کہ

آئی نور جہاں بمعہ سوٹ کیس کے اندر تشریف لے آئیں۔

”آئی! دھنک خوشی سے اچھل پڑی۔

آئی جو اتنی مہربان اور دلچسپ شخصیت تھیں!

”ارے بیٹا تم۔“

”ہاں آئی۔ تسلیم کی شادی پر میں اور فرزانہ جا رہے ہیں۔“ فرزانہ کو دھنک کے سب

ملنے والے اسکی مخلص دوست کے حوالے سے جانتے تھے۔

”ارے تو میں کہیں اور تھوڑی جا رہی ہوں۔ وہیں تو جا رہی ہوں۔ کب کا بلاوا آیا رکھا

ہے۔“

دھنک نے انکا سوٹ کیس اوپر اپنے سامان کیساتھ رکھ دیا۔ آئی بھی انہیں کیساتھ بیٹھ

گئیں۔

پھر تو جو گپ شب شروع ہوئی مزا آ گیا۔

دو چار میل اور گزر گئے۔

اب چشیل میدان تھا۔ اس پر خورد و جھاڑیاں۔

دھنک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ چشیل میدان اور خورد و جھاڑیوں کا اپنا حسن تھا۔

پھر۔ وہ چونکی۔ ساتھ چلتی سڑک پر جیپ میں فخر عالم جا رہا تھا۔ اس نے یقیناً اسے

دیکھا تھا۔ جیسی کبھی کبھار اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیتا مگر۔ پرکشش چہرہ بالکل ساٹ تھا

اور دلنشیں آنکھیں کسی بھی جذبے سے عاری تھیں۔ وہ بہت قریب سے جا رہا تھا اور۔ اکیلا

تھا اس وقت۔ کسی کاروباری کام سے شاید جا رہا تھا اسی لئے فریدہ ساتھ نہیں تھی۔ بہر حال۔

دھنک نے رخ اندر کی طرف کر لیا۔ انگاروں پر جمی راکھ کو پھونک مارنے سے فائدہ؟

جل ہی تو جانا تھا!

وہ کس طرف نکل گیا؟ ٹرین کس رخ جانگلی تھی؟ اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔

فرزانہ نے ہی اسے چونکایا۔ آنٹی بھی جلدی جلدی اپنا سوٹ کیس اتارنے لگیں۔
دھنک نے گہرا اطلاع کی ہوئی تھی۔ ڈرائیور گاڑی لیکر آچکا تھا۔ تینوں بیٹے کر گھر آ گئے۔

شادی میں بڑا سزا آیا۔ اسکا بہنوئی بہت اچھی طبیعت کا اور خاصا پیئڈم تھا۔ ہر دستور پورا ہوا مگر جلدی اور سادگی سے انجام پایا۔ کیونکہ کمال نے ویسے کے اگلے ہی دن لنڈن کیلئے روانہ ہو جانا تھا۔ تسلیم حسب پروگرام ساتھ نہ جاسکی تھی کہ اسکے ابھی کاغذات تیار ہونے میں چند دن تھے۔ کاغذات تیار ہوتے ہی اس نے لنڈن کمال کے پاس پہنچ جانا تھا۔ دھنک اور فرزانہ کی بھی صرف چار دن کی چھٹی تھی سو وہ دونوں اور آنٹی نور جہان بھی ویسے کے فوراً بعد پھر سے ٹرین میں چل پڑیں۔

فرزانہ اور آنٹی نور جہان کی موجودگی میں سفر بہت اچھا کٹ رہا تھا۔ گپ شب میں وقت کا پتہ نہیں چل رہا تھا اور پھر آج تو رات بھی اس نے اور فرزانہ نے آنٹی کے بہت اصرار پر ان کے یہاں گزارنی تھی۔

ٹرین اپنی مخصوص چال اور رفتار سے چلی جا رہی تھی۔

چار سورات کی سیاہیاں اتر آئی تھیں۔ ٹرین میں بتیاں جل رہی تھیں اور — ڈنر کی کراکری اور کٹلری کھنگ رہی تھی۔

آٹھ بج چکے تھے۔ انہوں نے بھی کھانا منگوا یا۔ چٹ پٹا، پیلا، میزنگ۔

تینوں دلچسپ باتوں کے دوران لذیذ کھانے سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔

ٹرین رواں دواں تھی۔ پلٹرز تھکے تھکے!

دھنک اور فرزانہ نے دیکھا۔ سیٹ کی پشت سے سر نکالے لکائے آنٹی کو غنودگی نے آلیا تھا۔

”دھنک“ فرزانہ نے دھیرے سے اسے مخاطب کیا۔

”ہوں“۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

پاک سوسائٹی
ڈاٹ

READING
Station

پتہ نہیں کیوں؟ کوئی اسکی شادی کا ذکر چھیڑتا تو اسے محوم پھر کر فخر عالم کی یاد آجاتی۔ کہ
کہ وہ اب تک اسے بھولی نہیں تھی کہ یہ اسکے بس میں نہ تھا مگر اسکی یادوں کو وقت کی راکھ تلے
دبانے کی کوشش ضرور کی تھی۔

رات قریباً گیارہ بجے وہ لوگ آنٹی نور جہاں کے ہمراہ ٹرین سے اتر گئیں۔ ٹیکسیاں تیار
کھڑی تھیں۔ ایک میں بیٹھ کر وہ لوگ بھی گھر کو چل پڑیں۔

سخت سردی تھی یہاں۔ برف اب بھی جگہ جگہ جمی نظر آرہی تھی۔ جبکہ اندھیرے میں بھی
پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

نظرس پہنکنکیں آنٹی کے مشرقی پردوں پر ٹھہر گئیں۔ آسمان کو چھوتے بلند وبالہ چیز و صنوبر
کے درخت، برف، بادل، کہر سب مل کر قدرت کی عظمت کو اجاگر کر رہے تھے۔ جا بجا فوگ
لائٹس اس وقت بھی روشن تھیں۔ شاید آنٹی کا مشرقی پردوی آج ادھر ہی تھا۔

ہزار کوششوں سے سنبھالا دل اس وقت پھر اٹھل پٹھل ہونے لگا۔ یہاں اس نے چند
بہت خوبصورت اور یادگار دن گزارے تھے۔

اسے کئی باتیں یاد آئیں۔ فخر عالم اس ڈاکٹر سے جس سے اسکا علاج ہو رہا تھا جلتا سا تھا۔ اپنے
دوست کامران کا دھنک سے فری ہونا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ کسی طرح چاہتا تھا کہ وہ رک جائے
مگر روکنے کا کوئی جواز نہ ملتا تھا۔ کئی باتیں ایسی تھیں جو بن کے محسوس کی جاسکتی تھیں۔
”چلو نا اندر۔ برف کی طرح تم بھی جم جانا چاہتی ہو کیا۔“ فرزانہ تھی۔

”چلو۔“ وہ اندر کی طرف بڑھی۔

رات گزار کر وہ اور فرزانہ دوبارہ ٹرین میں سوار ہو گئیں۔ اگرچہ دل دونوں کا واپس
جانے کو نہیں کر رہا تھا۔ یہ جگہ ہی اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ جی چاہتا تھا وہ جاؤ یہاں، بس جاؤ
یہاں۔ کبھی واپس نہ جانے کیلئے!

”خبر سے سنو۔ آنٹی نے مجھے خاص طور سے تمہیں سمجھانے اور اس بات پر
Convince کرنے کو کہا ہے۔“

”کس بات پر؟“ رخ موز کر وہ فرزانہ کو دیکھنے لگی۔

”ایک لڑکے کامران کا تمہارے لئے رشتہ آیا ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کسی دوست کے
گھر دیکھا تھا۔ شاید تم نے بھی دیکھا ہو۔ بہر حال ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ جا ب، فیملی،
کریکٹرز سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب انکار مت کرنا۔ آنٹی کہتی تھیں چھوٹی بہنیں بیاعی جاری
ہیں اور یہ بات ہی نہیں سنتی۔ وہ چاہتی ہیں انکی زندگی میں ہی تم سب اپنے اپنے گھروں کی
ہو جاؤ۔ تمہاری جا ب انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی...“

دھنک کو بہت کچھ یاد آیا۔ کتنی باتیں، کتنے واقعے، کتنے حادثے... فخر عالم کے یہاں
قیام کے دوران...!

”سن رہی ہونا؟“ اسے سوچ میں ڈوبادیکھ کر فرزانہ پھر بولی۔

”آں... ہاں۔“

”اچھی طرح سوچ لو اس بات پر۔ اور پلیز نامت کرنا۔ مجھ سے آنٹی نے جلدی جواب
مانگا ہے۔“

کامران کو اسکا خیال کیسے آگیا؟ لابی سی چیز تھا۔ بہر حال۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ فرزانہ نے پھر کہا۔

وہ ہنس دی۔

”بھئی تو تم ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات کر رہی ہو۔ سوچنے تو دو نا۔“ وہ فرزانہ کی
خاطر بولی۔ ورنہ اسے شادی کے ذکر سے ہی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

”جلدی سوچ لو۔ جواب جلدی دینا۔“

”اچھا بابا۔“

اور وہ پھر سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

منزلیں جدا ہو گئی تھیں۔

موٹر بائیک ایک طرف پارک کر کے دھنک کیساتھ آصف بھی بک سٹال میں داخل ہو گیا۔
بڑے سے بک سٹال میں دھنک کارڈز پر اور آصف یون سی کتابوں پر سرسری نظریں
دوڑا رہا تھا۔

آصف نے اپنے ہاتھ شارک کاج خرید اور بچوں کی طرح خوش خوش دھنک کے پاس پہنچا۔
”پلیز! یہ یہاں لگا دو نا!“ اس نے اپنی جیکٹ کے بائیں طرف اشارہ کیا۔
”اوہ۔ Scorpio“ وہ اس کاج دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔
”کیوں؟“

”یقین کرو مجھے بچھو کی تصویر سے بھی نفرت ہے۔“ وہ بری سی شکل بنائے کھڑی تھی۔
”کم آن دھنک۔ لگا دو پلیز!“
”کوئی اچھا شار لیکر نہیں آسکتے تھے۔“ وہ مسکرانے ہوئے اسکے ہاتھ سے بیچ لیکر بہت
احتیاط سے اس کی جیکٹ پر لگانے لگی۔

جیسے ذرا بے احتیاطی ہوئی اور پچھونے ڈنگ مار دیا۔
”اتنا ڈر پوک تو میں تمہیں نہیں سمجھتا تھا۔“ آصف ہنس دیا۔
”ڈر پوک نہیں... مجھے... ڈر لگتا ہے۔“ وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔
”ایکسکیوز می۔“ فخر عالم تھا۔ موسم کے لحاظ سے بہترین سوٹ زیب تن کئے گزرنے
کیلئے دھنک سے راستہ مانگ رہا تھا۔ مگر۔
جیسے کاٹ کھانے کو تھا!
اسکی کسی قسم کی پابند نہ ہوتے ہوئے بھی دھنک یکدم محتاط سی ہو گئی۔ پھر ایک طرف ہٹ
کر اسے راستہ دیا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ مسٹر عالم ہواؤں سے کیوں لڑتا پھرتا ہے؟“ آصف اسی خوشگوار سی سے

بولتا۔

اب پھر وہی ڈیوٹی تھی۔ وہی دھنک کا آفس اور فرزند کا کالج۔ گردش صبح و شام!
آج چھٹی پر آفس سے وہ آصف کیساتھ موٹر بائیک پر بیٹھ گئی۔ نیلم کی برتھ ڈے آنیوالی
تھی اس نے اس کیلئے برتھ ڈے کارڈ خریدنا تھا۔
دونوں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔

معا۔ پیچھے ہارن ہوا۔

دھنک نے چونکتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔

فخر عالم کا ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا اور فخر عالم پیچھے بیٹھا نہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے
بھر میں ہی اس نے نوٹ کیا۔ فخر عالم کے پرکشش چہرے کے نعوش تاؤ کی زد میں تھے۔ اور
سیاہ چمکتی آنکھیں جیسے بادِ جود کو شش ضبط کے غصہ غصہ سی تھیں۔

دھنک سے نظریں چار ہوتے ہی اس نے نگاہیں سامنے جمادیں۔

جانے کیوں؟ دھنک کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ اسے اب بھی دھنک کا خیال تھا!
مگر پھر۔۔۔ تنگی سے مسکرا دی۔

اسے اب بھی دھنک کا خیال تھا۔ وہ کب کہتی تھی کہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اسے
چاہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اسکی شادی ہو گئی تھی اور اب اسے محتاط رہنا چاہیے تھا جسکی۔ شاید
وہ کوشش بھی کر رہا تھا۔ جیسی تو اپنے جذبات چھپانے کی خاطر سامنے دیکھنے لگا تھا۔
اسے شاید آج پھر اسکا آفس کیساتھ بائیک پر بیٹھنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اسکی ناراضگی پر وہ
واقعی اسکے بعد آصف کیساتھ نہیں بیٹھی تھی مگر۔

اس نے گہری سانس لی۔ اب وہ بھی اسکی پابند نہ رہی تھی۔ دونوں کے راستے الگ

”پتہ نہیں“۔ دھنک نے خوبصورتی سے کندھے اچکائے۔

”کارڈ خرید لیا؟“

”ہاں۔ چلو۔“ بیج لگا کر وہ چلنے کو تیار ہوئی۔

اور۔۔۔ دونوں باہر آ کر دو بارہ بائیک پر بیٹھ گئے۔

دھنک دنوں بعد خوش خوش چمک رہی تھی پر۔۔۔

فلٹ کی سیرھیاں چڑھنے لگی تو احساس ہوا۔

وہ تو کسی اور کا تھا۔ وہ کیوں خوش ہو رہی تھی؟

صرف یہ ہی تو کافی نہیں تھا کہ فخر عالم کو شاید اب بھی اس کا خیال تھا، پروا تھی۔ اسکی شادی اسکی

بیوی ایک مسلم حقیقت تھی۔ اور وقت کیساتھ ساتھ اس نے دھنک کو بہر حال بھول جانا تھا۔

اور۔۔۔ اور۔۔۔ بعد میں شاید وہ اپنے اسی پیار کو یاد کر کے فریاد ہی کے ساتھ مل کر اپنے اوپر

ہنستا، اپنی بیوقوفی سمجھتا

گہری سانس لیتی وہ تھکی تھکی سی فلٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

آج گل داؤدی کی سالانہ نمائش شروع ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً ہر سال یہ نمائش دیکھنے

جایا کرتی تھی۔ سفید، گلابی، کاسنی، زرد، سنہری تقریباً سبھی رنگوں میں سب ایک ہی قطار

در قطار۔۔۔ جیسے گل داؤدی کی بہار آگئی ہو۔ پھر سفید بھول تو اتنے بھلے لگتے کہ وہ کتنی کتنی دیر

کھڑی آنکھوں کی پیاس بجھاتی رہتی۔

فرزانہ کو بھی اس نے تیار رہنے کو کہا تھا۔ آفس میں بس ماضی دینے جانا تھا۔ اور پھر

سیدھے Exhibition پر۔

”فرزانہ تم تیار ہو؟“ دس بجے کے قریب فلٹ پر آتے ہی اس نے جلدی مجاوی۔

”ہاں۔ بس یہ دوپٹہ استری کر لوں۔“

”جلدی کرو۔ کوئی ٹیک...“

ایگزپویشن کے پہلے دن کی بات ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ پرائز کس کے پھولوں کو ملا؟ تجو

کون کون تھے؟ سب پتہ چل جاتا تھا۔ اور پھر پھولوں کی ہاز کی بھی تو دیدنی ہوتی تھی ا

دھنک بھی جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ ڈارک گرین کپڑوں پر گرے جیکٹ اور گرے

ہی شوز پہنے۔ گھنے خوبصورت بالوں میں برش کیا اور۔۔۔

کندھے سے اپنا وینڈ بیگ لٹکاتی وہ تیار کھڑی تھی۔

”آصف بھی آئے گا۔“ دھنک نے اطلاع کہا۔

”وہ تمہارا کوئی بگ جوائنٹ ہائیک پر تمہیں چھوڑ کر جاتا ہے؟“ فرزانہ جو لے پہنچے ہوئے

ہلی۔

”ہاں۔ فرزانہ کو انی اسکی ہوگی تمہاری۔“

”نو—نو—ہہہہ“۔ جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے ہوئے اس نے سر جھٹکا۔

جانے کیا کہنا چاہتا تھا وہ؟ بہر حال غصہ غصہ سا دوسری طرف نکل گیا۔

دھنک نے نظروں ہی نظروں میں ادھر ادھر فرزانہ کو ڈھونڈا۔ دور پر لی طرف سنہری رنگ کے پھولوں کے پاس کھڑی کسی لڑکی سے باتوں میں مصروف تھی۔ دھنک بھی وہیں آگئی۔

”میری کولیک سلٹی۔ لیکچر ہے ہمارے کالج میں۔“ فرزانہ نے اس کا تعارف کرایا۔

”ہیلو“۔ دھنک نے اس سے ہاتھ ملایا۔

”اور یہ۔۔۔ دھنک ہے۔ آئینہ میگزین کی رپورٹر۔ ہم دونوں اکٹھی ایک ہی فلیٹ میں رہتی ہیں۔“

”اچھا اچھا“۔ سلٹی بولی۔ ”فرزانہ اکثر آپکی باتیں کرتی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”مجھے بھی“۔ دھنک خندہ پیشانی سے بولی۔

اور جب وہ تینوں ٹرائلنگس سے واپسی پر بس میں بیٹھیں تو۔

دھنک نے ٹڈھال ذہن سے سوچا۔ ابھی کتنے اور امتحان باقی تھے؟

معاذ سے کامران کا خیال آیا۔ کیوں نہ ہاں، کردے اور اس ساری جھنجھٹ سے نجات حاصل کر لے؟

فلیٹ پر پہنچ کر اس نے فرزانہ سے کہہ ہی دیا۔

”فرزانہ امی جو کامران کی بات کر رہی تھیں ٹھیک ہے تم میری طرف سے انہیں ہاں لکھو۔“

بغیر شادی کروائے اسے ماں باپ نے چھوڑنا تو تھا نہیں۔ پھر وہ کامران ہو چاہے کوئی

بھی۔ کیا فرق پڑتا تھا۔ شادی ہی کرنی تھی، سیٹل ہی ہونا تھا۔

کامران اچھا لڑکا تھا۔ بظاہر کوئی خامی نہ تھی۔ پھر امی ابو کا بھی ذہنی بوجھ کم ہو جاتا۔

فرزانہ خوش ہو گئی۔ اس کا خیال تھا دھنک کا دھیان بٹ جائیگا۔ کتنی کھوئی کھوئی رہتی تھی۔

فرزانہ بھی تیار ہوئی تو دونوں نیچے آگئیں۔ بس میں بیٹھیں اور مقررہ جگہ کے قریب بس سٹاپ پر اتر گئیں۔ دونوں نے دیکھا اسی بس میں سے آصف بھی اتر کر انکی طرف آ رہا تھا۔ گل داؤدی کی آج بھی بہار آئی تھی۔ دور دور تک مختلف رنگوں کے مختلف تختے سجے تھے۔ کوئی گولائی کی شکل میں، کوئی چوکور، کوئی ٹکون تو کوئی نیلے کی شکل میں۔ اور۔۔۔ ایک جگہ تو سفید گل داؤدی سلوپ کی صورت میں اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ چند لمحوں میں وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔

فرزانہ اور دھنک گھوم پھر رہی تھیں۔ دھنک اپنی نوٹ بک میں پوائنٹنس نوٹ بھی کرتی جا رہی تھی۔ کون سا رنگ تھا جو پیارا نہیں لگ رہا تھا۔ تختے اس قدر مہارت سے سجائے گئے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔

آصف اکیلا ہی فوٹو گرافی میں مصروف تھا۔

سلوپ میں بھی سفید گل داؤدی بہر حال نمبر لے گئی۔

ایک عجیب سی خوبصورتی تھی ان میں کہ جنہیں الفاظ بیان کرنے سے قاصر تھے۔ اوپر لگے نام سے پتہ چلا بیگم نواب جہانگیر خان کے تھے۔ ان کا ذکر وہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ متاثر بھی تھی ان سے۔ گودی بکنے کا اتفاق نہ ہو سکا تھا۔

سفید ہی پھولوں کے پاس کھڑی اپنی محویت میں وہ رخ موڑے بغیر ہی قدرے پیچھے ہٹی اور کسی سے جا کرائی۔

”سوری۔“ جلدی سے کہتے ہوئے اس نے پیچھے دیکھا۔

فخر عالم تھا۔ ڈارک گرے سوٹ میں ملبوس یونانی دیوتاؤں کی سی آن بان لئے تھا۔

وہ حجر میں سے تھا یہاں آ کر دھنک کو معلوم ہوا تھا۔

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ Why do you follow me?“ ددبیزاری سے بولا۔

دھنک کو اسکی بات اچھی نہ لگی۔ پھر بھی اپنے آپکو سنبھالا۔

اور اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟“

فیصلہ کر لیا تھا۔

”جان من کچھ وقت ہمیں بھی دو۔ آصف ڈیک پرا بیٹھا تھا۔

”ہوں۔ کیا ہے؟“ وہ چونکی۔

”بھئی کن سوچوں میں گم ہو۔ کچھ ہم غریبوں کا بھی خیال کرو۔“

”مثلاً؟“ وہ مسکرا دی۔ اسکی باتیں ہی ایسی اوٹ پٹانگ ہوتی تھیں۔

”مثلاً یہ کہ۔“ وہ چند لمبے سوچ میں پڑ گیا جیسے سوچ رہا ہو کہ کیا کہے۔ ”آؤ دونوں

شادی کر لیتے ہیں۔“

وہ بے اختیار ہنس دی۔

”بڑا تیر مارا ہے۔“

”نہیں۔ میں سیریس ہوں۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔“

”تو آؤ پھر۔ کرسی لیتے ہیں۔“

”مگر۔ کہاں کرینگے۔ کورٹ میں۔ سول میرج...؟“

”ہاں۔ جیسے تم کہو۔“

”تو آؤ نا۔ چلتے ہیں۔“

”چلو۔“ وہ واقعی اٹھ کھڑی ہوئی۔

آصف بھی ساتھ ساتھ چل دیا اور وہ دونوں چیف ایڈیٹر کو اپنی اپنی اسائینمنٹ دکھانے

اسکے آفس میں داخل ہو گئے۔

اسائینمنٹ۔ جس میں پھولوں کا ذکر تھا۔ یکم نواب جہانگیر خان کے سفید گل داؤدی

کو نمبروں قرار دیا گیا تھا مگر۔ ججز میں فخر عالم بھی تھا۔ یہ ذکر کہیں نہیں تھا۔

اداس چہرہ ویران آنکھیں۔ شاید اسی طرح ہی اسکے چہرے پر چھائی اداسی کی چھاپ ختم ہو،

آنکھوں کی ویرانیاں دور ہوں۔

اور۔ فرزانہ نے واقعی اسکی امی کو خط لکھ دیا۔

صبح لیڈر بکس میں دھنک کے سامنے ڈالا۔

اور دھنک چپ چاپ اپنے مقدر کے فیصلے کو کبھی رہی۔

آج آفس میں بھی وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ سوچوں میں گم۔

”ارے آپکے دانت کچھ زیادہ ہی خوبصورت نہیں ہیں؟“ پہاڑ پر فخر عالم کے یہاں

مسکرا دینے پر کامران نے اسے کہا تھا۔

وہ سرخ سی ہو گئی تھی۔

”میں ہمیشہ سچ بات کہتا ہوں آپ تمام کی تمام یعنی ساری کی ساری بہت خوبصورت ہیں

اور خوبصورت چیز کی تعریف نہ کرنا کفران نعمت ہے۔“ کامران بولے جا رہا تھا اور۔

فخر عالم بالکل سنجیدہ تھا اس دوران۔

”اب جاؤ۔ ناشتہ لگ چکا ہوگا۔“ اس نے کامران کو مخاطب کیا تھا۔

”ٹھہر ویار بات کرنے دو۔“ وہ پھر دھنک کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ”بائے داؤدے آپکا

نام کیا ہے مس؟“

”دھنک۔“ وہ دونوں دوستوں کی کھینچا تانی پر مسکرا رہی تھی۔

”یعنی تو س قزح یعنی رین بو۔ گوڈ۔ کتنا حسین نام ہے۔ کیوں فخر عالم؟“

اور۔ فخر عالم خاموشی سے جھکتے ہوئے اپنے کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔

کامران سمجھ گیا فخر عالم اس معاملے میں کوئی رائے دینا نہیں چاہتا تھا۔

”اچھا Pretty lady ہم چلتے ہیں۔“ کامران نے کہا تھا۔

اور پھر وہ دونوں چل دیئے تھے۔

ان سوچوں نے آج شاید اسلئے یلغار کر دیا تھا کہ آج اس نے اپنی زندگی کا اہم ترین

محبت کے سوا۔" فرزانہ نے ہمیشہ کی طرح اسکی تسلی کیلئے کہا۔
 دکھ سے مسکراتے ہوئے اس نے نم آنکھیں پونچھ لیں۔
 "فرزانہ تم نہ ہوتیں میرے ساتھ تو میں زندگی سے مشکل سے سمجھوتہ کر پاتی۔ کبھی کبھی مجھے
 لگتا ہے میں تمہاری تسلیوں اور حوصلہ افزائی کے سہارے زندہ ہوں۔"
 "آؤ اوپر چلیں۔ ٹی وی دیکھتے ہیں۔" فرزانہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔
 اور دونوں اوپر فلیٹ میں آگئیں۔

موسم نے ایک بار پھر انگڑائی لی تھی۔ سردی آخری مائیس لے رہی تھی۔ کلیاں چنگ کر
 بہار کی آمد کا پتہ دے رہی تھیں۔
 مائٹوں کے پھولوں کی خوشبو روح میں اتر رہی تھی۔ سویٹ پیز کی مہک بے خودی طاری
 کر رہی تھی۔ رنگ و بو سحر جگ رہی تھی!
 شام چائے کے بعد وہ اور فرزانہ فلیٹس کے نیچے والے لان میں بیٹھیں بہار کی مہکار
 سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔
 معائنے پر ڈی فلیٹ کا لڑکا آ کر فرزانہ کو ایک خط کا لفافہ تھما گیا۔ جو غلطی سے ڈاکر
 انکے گھر ڈال گیا تھا۔

فرزانہ نے جلدی جلدی کھولا۔ دھنک کی امی کا خط تھا۔ جو فرزانہ کے خط کے جواب میں
 آیا تھا۔ بقول انکے دھنک نے کامران کے حق میں ہاں کہہ کر نہایت عظمتی کا ثبوت دیا تھا
 اور سبھی اسکے اقرار سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ اسکے علاوہ کامران کے گھر والوں کو بھی
 ہاں کہلوادی گئی تھی۔

دھنک کو اچانک لگا جیسے اس نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلباڑی مار دی تھی۔ مگر۔
 دوسرے ہی لمحے خیال آیا۔ کیسے؟ کس کا انتظار تھا اسے؟ کس نے آنا تھا؟ کس نے اسے
 اپنا نا تھا؟ جو وہ اس رشتے پر پچھتا رہی تھی۔ اور پھر فخر عالم کے سوا تو ہر شخص اس کیلئے ایک برابر
 تھا۔ وہ کامران ہی تھی!

گزرے ہوئے لمحات۔ فخر عالم سے اسکی کورٹ کے آگے پوچھ چکھ، پھر اسکے پیچھے
 پہاڑ پر جا کر بہانے سے اسکے گھر کے اندر گھسنا۔ بعد میں بڑھتی ہوئی ملاقاتیں پیار و محبت کے
 عہد و پیمان اور بالآخر فخر عالم کی گھریلو پیچیدگیوں اور کسی اور کا حق مارنے سے ضمیر کی چینیں
 سے گھبرا کر اس کو چھوڑ دینا۔ سب یوں میں ہی اسکی نظروں میں گھوم گئے۔ اور شرتی آنکھوں
 کو نم کر گئے۔

"کچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ نئی دنیا بسانے کی سوچو۔ کیونکہ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں

READING
Station

”میں نے تمہیں مسز کامران سے بہت پہلے پر وہنڈ کیا تھا۔“
 ”اب کیا ہو سکتا ہے۔“

آصف نے گہری سانس لی۔

”ہاں اب کیا ہو سکتا ہے۔ کم از کم مٹائی تو کھلا سکتی تھیں۔“

وہ اسکی معصومیت پر ہنس دی۔ دھیرے سے۔

”کل لا دو گئی۔ میرا تو خیال تھا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ یہ کیا معلوم تھا کہ تمہیں پہلے سے خبر ہو چکی ہے۔“

”ایسی باتیں بھی کبھی چھتی ہیں۔“

”نہیں۔“ ہنسی روکتے ہوئے اس نے نشی میں سر بلایا۔

”ویسے اب بھی وقت ہے میری مانو تو یہ منگنی تو زرد۔“ آصف نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

”کیوں؟“

”اسلئے کہ پھر ہم دونوں شادی کر سکیں گے۔“

”بس کرو اب۔ کام کرو۔“

اور آصف نے واقعی سنجیدگی سے اپنے سامنے فائل کھول دی۔

آج گھر واپس جانے کیلئے وہ پھر بس سٹاپ پر کھڑی تھی۔

تجسبی آصف کا وہاں سے گزر ہوا۔ موٹر بائیک روک کر اسے پیچھے بٹھالیا۔ دونوں چل

پڑے۔

کچھ ہی دور گئے ہوئے کہ دھنک کی نظر پیچھے سے آتی گاڑی پر پڑی۔ فخر عالم تھا۔ آج

اپنی مرسیڈیز میں نہیں تھا۔ لینڈ کروزر چلا رہا تھا۔ ہمیں سے اسکے بھی آفس کارا سٹہ پڑتا تھا۔

اسکے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر ہی دھنک نے رخ آصف کی طرف کر لیا۔

معا انکی بائیک کے بالکل پاس سے زوں کی سی آواز آئی۔ آصف اپنا توازن قائم نہ

رکھ سکا اور وہ دونوں بمعہ بائیک کے آہستہ سے لڑھک کر کچے میں جا پڑے۔

دن دھیرے دھیرے سرک رہے تھے۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی، دن پھیل رہے تھے، راتیں سکڑ رہی تھیں۔

دن کو موتیا، رات کو رات کی رانی جادو جگا رہی تھی۔

آج دنوں بعد نلیم کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا منگنی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے اور دھنک اور فرزانہ

مقررہ وقت پر پہنچ جائیں۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا۔ کہ یہ دنیا کا دستور تھا۔ اسے منگنی کی انگوٹھی پہنانے

لڑکے والے آرہے تھے۔

وہ اور فرزانہ دونوں گئی تھیں۔ منگنی کی رسم سادگی سے ہو گئی۔ کامران کی بڑی بہن نے اسے

ہیروں سے جگمگاتی انگوٹھی پہنائی اور یوں وہ کسی اور کی امانت بن گئی۔

اگلے ہی دن فرزانہ اور وہ واپس آ گئیں۔ ڈیوٹی بھی تو تھی دونوں کی۔

ڈھیر ساری مٹائی جو امی نے فرزانہ کے حوالے کی تھی وہ اس نے فلیٹس میں بانٹی۔ خود

اپنی ٹیچرز کو کھلائی۔

”میرے ساتھ آئندہ بات مت کرو۔“ یہ آصف تھا جس نے چھوٹے ہی خفگی کا اعلان کیا۔

”کیوں؟“ وہ مسکرا دی۔

”یہ منگنی میرے ساتھ کرنی تھی۔“

”تمہیں کس نے بتایا میری منگنی ہو گئی۔“

”جناہ میری کزن پڑمتی ہے اسی کالج میں جس میں مس فرزانہ ٹیچرز کو تمہاری منگنی کی

مٹائی کھلا رہی تھیں۔“

”اوہ۔“ تو بات اس طرح پھیلتی ہے۔

متوجہ ہو۔“

”فکر مت کرو یہ لڑکی متوجہ نہیں ہوتی۔“

”ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے۔“

اور دھنک پھر ہنسی صاف چھپائی۔

تھوڑی دیر دونوں خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔

”یار پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے اس نے یہ جان بوجھ کر کیا ہے؟“

”تو؟“

”ان امیروں کی بھی کیا شان ہوتی ہے۔ میں اکثر اس کو اسی راستے سے گزرتے دیکھتا

ہوں۔ کبھی شوئر Driven نے موڈل مرسیڈیز میں شان سے پیچھے بیٹھا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار

جیب ہوتی ہے خود چلاتا ہے اسے۔ آج اس لینڈ کروزر میں تھا۔ روز روز گاڑیاں بدلتا رہتا

ہے...“

اچھی بات ہے تاہم یہ ہے تو خرچ کرنا چاہیے۔“

”آج بڑی اسکی سائیڈ لے رہی ہو۔“

”نہیں خیر ایسی بات بھی نہیں۔“

”تمہیں یاد ہے اس پر جو مرڈر کیس بنا تھا تمہیں یہ کتنا برا لگتا تھا۔ کبھی تمہیں دل چاہتا ہے

اسکی سیاہ چٹکتی آنکھیں پھوڑ لوں... اب ٹوٹی بدل گئی ہو۔“

”ظاہر ہے اصلی ملزم پکڑا جا چکا ہے اس بچارے کا کیا قصور؟“

”واہ۔۔۔ بچارا۔ کل کہو گی بے سہارا، بے آسرا، پھر کہو گی اکیلا۔“

”اب بس کرو آصف۔“ وہ مسکرا دی۔ ”تم تو اسی کو لے بیٹھے ہو۔“

”ویسے ایک بات ہے۔ ہے بہت شاندار۔ ٹال، ہینڈ سم، بالوں کا سٹائل دیکھو بلکہ رہن

سہن کا سٹائل دیکھو۔ کیا عالی شان چیز ہے۔ میں دل ہی دل میں فین ہوں اسکا تمہیں پتہ

ہے؟“

اٹھ کر کپڑے جھاڑتے ہوئے دھنک نے دیکھا فخر عالم وہاں سے آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور ویو مر میں سے وہ اب بھی ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یعنی یہ سب اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ اتنا قریب سے گزرا تھا کہ بائیک کا توازن ڈگمگایا تھا اور وہ دونوں کپے میں جاڑھے تھے۔ گویا اسکا مقصد بائیک کو یا ان دونوں کو نقصان پہنچانا تھا بس ذرا گرا دینے کا شوق چرایا تھا۔

تو۔ اس طرح سے وہ اس کے آصف کیساتھ بیٹھنے پر نہیں گرا کر خوش ہو رہا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی دھنک کو اسکی اس بچوں کی سی حرکت پر ہنسی آگئی۔

جانے کب تک وہ آصف سے جلتا رہیگا؟ پتہ نہیں کامران سے اسکی معافی کا معلوم ہوگا تو

کیا رد عمل ہوگا؟ بہر حال۔

”یہ۔۔۔ یہ مسٹر عالم اپنے آپکو سمجھتا کیا ہے؟“ آصف، دھنک اور فخر عالم کے کسی بھی

قسم کے تعلق سے ناواقف تھا۔ غصہ سے بائیک سیدھی کر کے اس پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ دھنک مسکرا رہی تھی۔

”کمال ہے تم مسکرا رہی ہو۔“

”تو روؤں بیٹھ کر۔“

”کچھ تو کہو نا۔“

”اچھا۔ شو مارنا ہے۔ سر پھرا ہے۔ دماغ خراب ہے۔ اپنے آپکو بہت اونچی چیز سمجھتا

ہے... کافی ہے یا تھوڑا اور بھی کہوں؟“ وہ بھی اسکے پیچھے جا بیٹھی۔

”کافی ہے۔“ وہ اسی جھنجلاہٹ سے بولا۔

اور دھنک ہولے سے مسکرا دی۔

”ویسے یہ سب اس نے جان بوجھ کر تو نہیں کیا تھا؟“

”جان بوجھ کر کیوں کرتا؟“ دھنک نے بات بنائی۔

”یار تم جیسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر دل کیا ہوگا کہ زوں کر کے تیزی سے گزر جاؤ شاید

”ہاں۔ جیسی تو اتنی سائید لیا کرتے تھے اسکی۔“

”تمہیں اب بھی برا لگتا ہے؟“

”ہاں۔“

”اب تو بقول تمہارے یہ بچارا ہو گیا ہے۔ یعنی قصور وار نہیں ہے۔“

”ہاں۔“

”پھر؟“

”پھر بھی اچھا نہیں لگتا۔“

”کیوں؟“

”بھی میری مرضی۔ دھنک جھنجلا اٹھی۔ سوائے فخر عالم کے کوئی اور بات کرتا ہی نہیں تھا۔“

”اتر جاؤ میری بائیک سے۔“ اسکا منہ پھولا پھولا تھا۔

”اتر رہی ہوں۔“ فلیٹس کا گیٹ آچکا تھا۔ ”خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ آصف نے بھی اسی لہجے میں کہا اور۔

آگے بڑھ گیا۔

آج شہر کی آبادی سے پرے مضافات میں بیگم نواب جہانگیر خان کے ہاں ڈنر تھا۔ بیگم صاحبہ بیوہ تھیں، تقریباً چالیس بیالیس سال عمر تھی، سنا تھا۔ بہت خوبصورت تھیں، بہت رکھ رکھاؤ والی تھیں۔ انکی رہائش گاہ خاص طور سے انکے باغات دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے یہاں کی پرانی طرز کی راہداریاں، پارہ دریاں اب بھی باہر سے آنے والوں کیلئے بہت کشش کا باعث تھیں۔

آج کا ڈنر کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر و بیشتر ایسی دعوے تھیں دیا کرتی تھیں۔ شاید پرانی روایت چلی آ رہی تھی یا پھر شاید بیگم صاحبہ اپنی تنہائی دور کرنے ایسی محفلیں سجایا کرتی تھیں۔ بہر حال۔

آج دھنک اور آصف بھی وہاں پہنچنے کو تیار تھے۔ آصف بطور فوٹو گرافر اور دھنک نے بیگم صاحبہ کا انٹرویو کرنا تھا۔

سفید مہین لباس میں وہ آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی۔ وہ بہت ایکسا پینڈ تھی۔ بیگم صاحبہ کی شخصیت اس کیلئے خاصی اٹریکشن کا باعث تھی۔ بلکہ دونوں ہی بہت خوش تھے۔ میگزین میں بیگم صاحبہ، مہمانوں اور انکی رہائش گاہ و باغات کی تصویریں بھی آجاتیں اور ساتھ میں ان کا انٹرویو بھی۔

شام کے دھند لگے اتر آئے تھے۔ پرندوں کے غول اپنے اپنے آشیانوں کی طرف رواں رواں تھے اور۔ قریب ہی نالے کے کنارے چلتا چھوٹا سا گڈریا بھیڑ بکریوں کے بڑے سے ریوڑ کو ہانکتا گھرواہس جا رہا تھا۔

آصف کی بائیک پر بیٹھے دھنک اور آصف چلتے چلے گئے۔ آٹھ بج چکے تھے وہاں پہنچنے

فخر عالم اسے کئی بار دیکھ چکا تھا، جانتا بھی تھا۔ دھنک نے اسے بتایا تھا وہ اسکا کوئی گھوڑا تھا۔
 ”سوری — مجھے آپ ایکسکیوز کر دیں۔“ وہ اٹھ کر ایک طرف ہو گیا۔ ”ہاں بیگم صاحبہ
 کی اپنی مرضی۔“

”کم آن ڈارنگ! کیا فرق پڑتا ہے۔“

فخر عالم مسکرا دیا۔ خوبصورتی سے۔

”Sorry Ma'am—I can't afford any scandle.“

”آپ سکیئنڈلز سے اتنے خائف کیوں رہتے ہیں؟“

آصف خاص صحافت کے انداز میں پوچھنے لگا۔

”میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔“ وہ اپنے مخصوص مبہم انداز میں مسکرایا۔ ”ورنہ وہ میرا
 انٹرویو بن جائیگا۔“

اور آصف صرف بیگم صاحبہ کے ہی چند پوز کیمرے میں اور کچھ بات چیت کاغذ پر محفوظ
 کر کے واپس آ گیا۔

”بات کچھ بنی کہ نہیں۔“ دھنک نے پوچھا۔

”فخر عالم صاحب نے تو صاف ایکسکیوز کر لیا۔ ہاں بیگم صاحبہ کی تصویریں اور انٹرویو کر لیا۔
 ویسے پتہ نہیں کیوں میری چھٹی حس کہتی ہے دونوں میں کچھ گڑبڑ ہے۔ اگر دونوں میں نہیں تو
 ایک میں تو ہے ہی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ — بیگم صاحبہ مسٹر فخر عالم پر ذرا ضرورت سے زیادہ ہی مہربان نظر آتی
 ہیں۔“

اور دھنک بے اختیار ہنس دی۔

”پریس والوں سے جیسی تو لوگ گھبراتے ہیں۔“

”صحافت کی ایک روح ہوتی ہے۔ اسے سمجھنے کیلئے دماغ ہونا چاہیے سمجھیں۔“

اندز بہت رونق تھی، بڑی چہل پہل تھی۔ علاقے کی قریباً تمام ایلٹیٹ کلاس انوائیڈ تھی۔
 جینٹس قیمتی سوئس اور لیڈیز بیش قیمت لباس پر دیدہ زیب جیولری پہنے تھیں۔ اعلیٰ کوالٹی کے
 سگریٹس کی اروما تھی۔ فرانس کی پرفیومری کی مہک تھی!

ادھر ادھر سے کانوں میں آواز پڑی۔ ڈنر فخر عالم کے اعزاز میں دیا گیا تھا!

وسیع و عریض لان میں لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے۔ کچھ ادھر ادھر رہ رہا رہا رہا رہا رہا
 پھر بارہ دریوں میں سے اردگرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کچھ شاید باغات
 میں محو خرام ہوتے۔ بہر حال۔

روشنیوں کی چکاچوند میں انہوں نے دیکھا۔ سامنے ہی مرمری ستونوں والے محرابی برآمدے
 میں بہت قیمتی اور خوبصورت صوفے پر بیگم صاحبہ تشریف فرما تھیں اور — اور — ساتھ میں
 اسی صوفے پر ایک طرف ہو کر فخر عالم بیٹھا تھا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں بہت ڈشنگ لگ رہا تھا۔
 گویا اتنے سارے مہمانوں میں وہ مخصوص مہمان تھا کہ میزبان جس پر خاص عنایت کئے
 تھیں۔ اسکو اپنے پاس صوفے پر جگہ دی تھی۔

جہاں باقی سب میزبان کی رہا نشاگاہ، رکھ رکھاؤ کے معترف نظر آ رہے تھے وہاں بیگم
 صاحبہ فخر عالم سے باتوں میں مجوسیے اطراف ہی سے بے خبر تھیں۔

”ہو جائے ایک تصویر؟“ آصف نے دھنک سے کہا۔

”پہلے اجازت تو لے لو۔“ اسے معلوم تھا فخر عالم پریس والوں سے دور بھاگتا تھا اور اگر

چپکے سے تصویر لے لی گئی تو میگزین میں دیکھ کر دھاڑنے لگے لگا۔

”ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔“

دھنک دور سے دیکھ رہی تھی۔

آصف اگلے پاس گیا۔

”ایکسکیوز می۔ کیا میں اپنے میگزین کیلئے آپ دونوں کی تصویر لے سکتا ہوں؟“

وہ اسکی عادات سے اب تک بخوبی واقف ہو چکی تھی۔ وہ کسی طور پر بھی Lime light میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ بقول اسکے وہ پریس والوں سے الرجک تھا۔
 ”اچھا۔ ٹھہرو میں یہاں کی کچھ تصویریں لوں گا۔“ وہ تصویریں لینے لگا۔
 دھنک نے دیکھا۔ چاق و چوبند باوردی بیرے اوول ٹیپڈ تالاب کے گردنگی ٹیبلو پر کھانا لگانے لگے تھے۔

یہاں جا بجا خوبصورت لیپ پوسٹس مضمون روشنی بکھیر رہے تھے۔ تالاب کا گہرا نیلا پانی، کھلا آسمان اور مدھر روشنیاں۔ عجیب خواب آور ساما حول تھا۔
 تبھی۔ کھانا لگنے کا اعلان ہوا۔

سبھی ٹیبلو کے گرد مٹ آئے۔ انواع و اقسام کے کھانے لگے تھے۔ لمب رومٹ چکن ٹکڑے، باربی کیو، کئی قسم کی سلاڈ، سویٹ ڈشز!
 مہمان اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانا لیکر یہاں وہاں بکھرتے ہوئے خوش گپیوں کے دوران سحر انگیز ماحول میں لذیذ کھانوں کا لطف لینے لگے۔

”ایک پوائنٹ اوٹ۔“ آصف پلیٹ میں کھانا لئے اسکے پاس آیا۔
 ”پھر کیا ہوا؟“

”تم نے خیال کیا تھا۔ اول نمبر سفید گل داؤدی کو قرار دیا گیا تھا۔“
 ”تو؟“

”ججز میں مسٹر فخر عالم بھی تھا۔“
 ”پھر؟“

”خود بھی کچھ سمجھا کرو۔ بیگم صاحبہ سے کچھ دلچسپی ہے جیسی تو...“
 ”بڑی دور کی کوڑی لائے ہو۔“

”مانتی ہوتا۔“

”آصف ایمان کی کہو سفید گل داؤدی سب میں متاثر کن تھی یا نہیں؟ تم ججز میں سے

”بس بس میں تمہاری تعریف نہیں کروں گی۔“

”تعریف شاید کچھ نظر آئی ہے جیسی تو کہہ رہی ہو۔“

”ہونہہ۔۔۔ چالیس پالیس سالہ بیوہ اور میں تیس سالہ لڑکا۔ تم نے بھی کیا جوڑی ملائی ہے۔“

”مان او۔ کچھ نہ کچھ ہے۔“

”میں نہیں مانتی۔“

”اسلئے کہ ابھی شروعات ہیں اور بات یکطرفہ ہے یعنی صرف بیگم صاحبہ کی طرف سے ہے بعد میں دوطرفہ ہو جائیگی۔“

”اسکی اپنی بیوی کدھر ہے؟“ دھنک نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”ہوگی کہیں فرینڈز وغیرہ کیساتھ۔ سنا ہے وہ بھی خاصی ایڈوانس ہے۔“

”چلو جانے دو۔ آؤ اس طرف بارہ دوری چلتے ہیں۔“

اور دونوں وہاں سے چل دیئے۔ دور بائیں دھنک کی نظر فخر عالم پر پڑی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں پتہ ہے ڈنر کے مہمان خصوصی مسٹر فخر عالم ہیں۔“

”ہاں۔ کچھ دیر پہلے ہم دونوں نے یہ بات ایک ساتھ سنی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے

یاد دلایا۔

”ویسے ایک اور چیز میں نے نوٹ کی۔ یہ مسٹر عالم تو بہت خوش اخلاق ہیں۔ جیسا

میرا خیال تھا ایک امیر مغرور شخص ہوگا۔ ایسا تو بالکل نہیں۔ بڑی خوشگواہری اور خوش خلقی سے بات کر رہا تھا۔“

”انٹرویو میں اسکا کوئی ذکر مت کرنا خدا کیلئے۔“ دھنک خائف سی بولی۔

”نہیں کرونگا مگر کیوں؟“

”بس اس نے جو منع کر دیا سو منع کر دیا۔“

فخر عالم کا سائید تھا۔

”تم تو بس سوڈل بن کر کھڑی رہو۔ سارا کام مجھے کرنا پڑ رہا ہے۔ انٹرویوز، فونو گرافی...“
آصف حسب عادت فری فریک لہجے میں بولا۔

”تو کیا ہوا۔ مشکل وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں... اور پھر میں تمہارے لئے سویت ڈش بھی تو لائی ہوں...“
”کہاں ہے؟“

”اسی میں سے کھاؤ۔ الگ پلیٹ نہیں لاسکتی تھی۔“ دھنک نے اپنی پلیٹ اسکی طرف بڑھائی۔

”جب سے کامران صاحب کی مہرگی ہے تم پر کامل ہوتی جا رہی ہو دن بدن۔“ وہ اسکی پلیٹ میں سے چھج بھر کر منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

دھنک کی نظریں فخر عالم پر پڑیں۔ مارے غصے کے بے گل سالگ رہا تھا۔ کان ادھر ہی لگے تھے۔۔۔ کامران کے نام پر چونک سا پڑا۔

”ویسے تمہاری منگنی کی انگوٹھی ہے زبردست۔ لگتا ہے بڑی آسامی ہے۔“

بے دلی سے باتوں میں معروف فخر عالم بے چین سا نظر آنے لگا۔

”مجھے آسامی داسامی کا نہیں پتہ میں نے صرف کامران سے منگنی کی ہے۔“ دھنک دھیرے سے بولی مگر۔ لگتا تھا فخر عالم ہر تن گوش تھا۔ کیا دھبی کیا اونچی سبھی باتیں سن رہا تھا۔

معا آصف کی نگاہ اپنی گھڑی پر گئی۔

”دھنک چلتے ہیں دیر ہو رہی ہے۔“ وہ آخری چھج منہ میں ڈالتے ہی بولا۔

”ہاں۔“ دھنک نے فوراً پلیٹ اسے تھمائی۔

آصف جا کر پلیٹ میز پر رکھ آیا۔

اور دونوں باہر گیٹ کی طرف بڑھے۔

ہوتے تو اپنی رائے سفید پھولوں کیلئے ہی دیتے یا نہیں؟ اس نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

”تم ہی نے تو کہا بڑی دور کی کوڑی لائے ہو۔“ وہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے بولا۔

”غصہ آیا تھا مجھے۔ خواہ تو اسکی پر شک کرنا اچھی بات نہیں۔“

”ہم صحافی شک نہ کریں تو سچائی تک کیسے پہنچیں۔ ہمیں پہلے شک پڑتا ہے۔ پھر ہم پیچھا

کرتے ہیں اور پھر کہیں جا کر حقیقت تک پہنچتے ہیں سمجھیں؟“

”بس بہت سمجھ گئی۔ اب کھانا کھاؤ۔“

آصف قدرے آگے بڑھا اور مہمانوں کے ہجوم میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تبھی۔۔۔ دھنک کو اپنے آس پاس فخر عالم کی مخصوص مہک محسوس ہوئی۔

دائیں طرف دیکھا اونچی وہ کھڑا تھا۔

”تم۔۔۔ یہاں رات کے وقت کیوں آئی ہو؟“ اسکے لہجے میں تحکم تھا۔

”ڈنر رات کو ہی ہوتا ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”تم کیوں بھول جاتی ہو کہ تم ایک لڑکی بھی ہو۔“ اسکے لہجے میں تیزی آئی۔

”میری مرضی میں کچھ بھی کروں۔“

اور۔۔۔ فخر عالم نے جیسے غصہ بڑی مشکل سے ضبط کیا۔

”دل چاہتا ہے تمہیں اتنا ماروں اتنا ماروں کہ۔۔۔ ساری جرنلزم دھری رہ جائے۔“

اسے مزید تیز ہوتے دیکھ کر وہ دوسری طرف چل دی۔ کیونکہ وہ یہاں کی بہت اہم

شخصیت تھا۔ لوگوں کی نظریں اس کیساتھ ساتھ دھنک پر بھی پڑ سکتیں تھیں اور۔۔۔

وہ بھی کوئی سیکنڈل نہیں چاہتی تھی۔

آصف نے چند اور مہمانوں کے خیالات انکے میزبان کے بارے میں نوٹ کئے۔ کچھ

تصویریں اور بنائیں اور واپس دھنک کو ڈھونڈتا اس تک آپہنچا۔

پاس ہی تھوڑے فاصلے پر جانے کہاں سے گھوم پھر کر فخر عالم بھی آکھڑا ہوا تھا۔ پلیٹ میں

کھانا لئے ایک لڑکی سے ٹوکھٹو تھا۔ شاید فریدہ تھی۔ بہر حال لڑکی کی ان کی طرف پیٹھ تھی اور

اور

خط پر نظریں دوڑانے لگی۔

خط پڑھ کر ایک نظر دھنک پر ڈالی۔ وہ اب بھی خالی خالی نظروں سے خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ چہرے پر کسی بھی قسم کا جذبہ لے لے بغیر۔

فرزانہ نے گہری سی سانس لی۔ خط تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں ڈالا۔ لفافہ درمیانی میز پر رکھا۔

”تم پریشان ہو؟“ فرزانہ کا لہجہ اداس تھا۔

”نن... نہیں تو“۔ وہ چونکتے ہوئے اسکی طرف دیکھنے لگی۔

اسکے خوبصورت لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ جسے پھر فرزانہ سمجھ نہ پائی۔ اداسی کی تھی خوشی کی تھی یا یوں ہی بغیر کسی مطلب کے؟

”دفع کرو۔ کامران میں کوئی سرخاب کے پر تھوڑی لگے تھے۔ کہیں اور لکھی ہوگی تمہاری قسمت۔ پہلے بھی اچھے خاصے رشتے آچکے ہیں تمہارے۔ آگے بھی امید رکھنی چاہیے۔“

”مجھے کب شادی کی اتنی پروا رہی ہے۔ امی کی خواہش پر ہاں کہہ دی تھی۔“

”وہ تو ہے۔ چھوڑو پرے اس ٹوک کو۔ آؤ اٹھو کھانا کھائیں۔“ فرزانہ نے اسے ہاتھ سے اٹھایا۔

دھنک کی محسوسات کچھ عجیب سی ہو رہی تھیں۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ چپ چپ سی تھی۔ اسے کامران سے کوئی قلبی لگاؤ نہیں تھا یہ تو طے تھا۔ اسے شادی کی کوئی خاص پروا تھی

ایسی بھی بات نہیں تھی پھر؟ پھر کیوں اسے چپ سی لگ گئی تھی۔

تحقیر و تضحیک، توہین! یقیناً اسے یہ احساس تھا۔

اور پھر۔ اچانک اسکے ذہن میں کوند اسالپکا۔ کہیں یہ فخر عالم کی کارستانی تو نہ تھی؟ اس رات بیگم جہانگیر کے یہاں ڈنر پروہ آصف اور دھنک کو کامران سے اسکی منگنی کا ذکر کرتے سن

چکا تھا۔ شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر کیوں؟

گرمی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ گلاب کھل اٹھے تھے، موتیا کی مہک فضاء میں رچ بس گئی تھی اور۔۔۔ رات کی رانی راج کرنے لگی تھی۔

آفس سے تھکی ہاری وہ فلیٹ پر پہنچی تو حسب عادت بچن بکس پر نظر ڈالی۔ پھر خوشی سے کھل اٹھی۔ مگر سے خط تھا۔ دنوں بعد کوئی خط آیا تھا۔ امی کو شاید کاموں سے فرصت نہیں ملتی تھی اور نینم تو تھی ہی ست۔ آج مہربانی کر ہی ڈالی تھی۔

انداز پنے چھوٹے سے لوگ روم میں آکر اس نے بیگ کو نے میں کھڑے بیگ سے لٹکایا۔ کھڑکی کے قریب آرنڈ چیر پر ٹانگیں سیدھی پھیلا کر بیٹھتے ہوئے اہتمام سے خط کھولا۔ سلام دعا خیریت کے بعد لکھا تھا۔

”باجی! کامران کی بہن کا خط آیا تھا لکھا تھا۔ کامران تین سال کیلئے امیریکہ جا رہا ہے۔ ظاہر ہے تین سال تک بات التوا میں پڑ جائیگی۔ اسلئے ہم آپکو لٹکائے رکھنا نہیں چاہتے۔ آپ چاہیں تو دھنک کی شادی کہیں اور کر سکتے ہیں...“

اور دھنک دیر تک یوں ہی بیٹھی خالی خالی نظروں سے سامنے تکتی رہی۔

تجھی فرزانہ آگئی۔

”کیوں؟ خیریت؟“ فرزانہ تازگی اسکی گود میں رکھے خط سے اور اسکی خالی خالی

نظروں سے۔

دھنک مسکرا دی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں نہ خوشی تھی نہ اداسی۔

بغیر نہ سے کچھ کہے آہستہ سے خط فرزانہ کو پکڑا دیا۔

فرزانہ نے خط لیتے ہوئے اپنا بیگ بیگ سے لٹکایا۔ واپس آکر اسکے مقابل کرسی پر بیٹھی

خرد تو شادی کر لی تھی اب اسکی راہ میں کیوں روڑے اٹکارہا تھا؟
اگر اس نے واقعی ایسا کیا تھا تو یہ اسکی شان کی نفی کرتا تھا۔
اور اگر اس نے یہ سب نہیں کیا تھا تو پھر کامران نے اسکی توہین کی تھی۔
وہ سوچتی چلی گئی۔

اور۔۔۔ اگر کامران کی یہ بات درست تھی کہ وہ تین سال کیلئے اسے پابند نہیں کرنا چاہتا
تھا۔ تو یہ اسکی صاف گوئی تھی۔ اور صاف گوئی اسے ہمیشہ پسند رہی تھی گو تلخ ہوتی تھی اکثر!
”کل تو پینٹنگ کی نمائش بھی دیکھنے جانا ہے۔ دیکھنا تمہاری پینٹنگ کو پرائیز ملے گا۔“
فرزانہ نے اسکا دھیان پٹانے کو کہا۔

”کیا یہ اتنی خاص تو نہیں۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے آپے میں آرہی تھی۔

اس نے انہی ڈیزیز کو کیونوں پر اتارا تھا جو اس نے فخر عالم کے جنگل اور آس پاس میں
دیکھے تھے۔

”تھوڑی دیر ریٹ کرتے ہیں پھر چلتے ہیں ڈاکٹر ماریا کی طرف۔ ابھی آتے ہوئے کہہ
رہی تھیں دونوں آنا ان کی بہن کی شادی کی مووی دیکھیں گے۔“

”لیکن تمہیں پتہ ہے مجھے ایسی موویز سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”نہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ سارا وقت بس میگزین کا آفس پھر اسکی خدمت میں ادھر ادھر

گھومنا اور اسکی ٹیمٹ تیار کرنا۔۔۔“ وہ اسکا خیال بدلنا چاہتی تھی۔

دھنک نے گہری سانس لی۔ پھر سکرادی مر

اب کے اسکی سکر اہٹ میں کوئی تناؤ کوئی پریشانی نہ تھی۔

”اچھا۔ تھوڑی دیر سوتے ہیں پھر چلیں گے۔“ وہ کرسی پر سے اٹھنے لگی۔ اب اسکی بات

میں بھی کوئی بوجھل پن نہیں تھا۔

فرزانہ خوش ہو گئی۔ اسے تسلی ہوئی۔ ایک عرصہ سے اکٹھے رہنے سے وہ اسے بہنوں کی

طرح چاہنے لگی تھی۔ اس کے دک میں دکی ہو جاتی تھی اسکی خوشی میں خوش!

آج دھنک اور آصف نے جلدی جلدی آفس کا کام نٹایا اور ٹھیک دس بجے نمائش پر آرٹ
گیلری جا پہنچے۔ وہ دونوں بطور پورٹرز گئے تھے۔ ساتھ ہی دھنک نے اپنی پینٹنگ کا حشر بھی
دیکھنا تھا۔ فرزانہ ان سے پانچ دس منٹ پہلے ہی پہنچ کر وہیں ایک طرف منتظر کھڑی تھی۔

آصف تصویریں لے رہا تھا۔ دھنک مختلف لوگوں کے بتائے شاہکار دیکھتی ملاحظہ ہوتی
نوٹ بک میں نوٹ بھی کرتی جا رہی تھی۔ فرزانہ ساتھ ساتھ تھی۔

”کتنے زندہ پھول ہیں اور اطراف کا ماحول۔۔۔ دل چاہتا ہے یہیں رو جاؤ۔“ کسی نے
گزر بھر کے فاصلے پر کہا تھا۔

دھنک نے مڑ کر اپنے بائیں طرف دیکھا۔

اسکی پینٹنگ کے پاس کھڑی بیگم جہانگیر خان تھیں اور ساتھ۔۔۔ فخر عالم سفید قیمتی سوٹ

میں ملبوس اپنی سحر انگیز شخصیت سے پورے ماحول کو سحر انگیز بنا رہا تھا۔

”دھنک۔۔۔ پینٹنگ زیادہ خوبصورت ہے یا نام؟“ بیگم جہانگیر نے فخر عالم کو مخاطب

کیا۔

جانے کیسے فخر عالم اور دھنک کی نظریں ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف اٹھیں۔

ایک ہل کو دونوں طرف قد بلیس ہی جل اٹھیں اور پھر۔۔۔ ایک ساتھ ہی بچھ گئیں۔

”دھنک؟ پینٹنگ؟“ فخر عالم نے بیگم جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے خوبصورتی سے

کندھے اچکائے۔ ”مجھے ان چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔“ اس نے خالص جھوٹ

بولتا تھا۔

”اوہ۔۔۔ تو پھر آئے کیسے آپ؟“

پر۔ بات آج بھی ایک طرف ہی لگ رہی تھی!

اسے حیرت بھی ہوئی۔ بیگم جہانگیر کی فخر عالم سے اس قدر بے تکلفی پر۔ پھر دونوں کی عمروں میں بھی خاصا فرق تھا!

”ہوتا ہے ہوتا ہے“۔ آصف آپہنچا تھا۔ اور بیگم جہانگیر اور فخر عالم کو ایک ساتھ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں“۔

”میں کیوں پریشان ہو گئی“۔ دھنک جلدی سے بولی، دل میں چور جو تھا۔

”میرا مطلب ہے حیران ہونے کی ضرورت نہیں“۔ اس نے اپنی بات کی تصحیح کی۔

”ویسے یہ سب کیا ہے آصف“۔ وہ کچھ الجھی الجھی سی بولی۔

”باروگولی۔ کرنے دو لوگ جو کرتے ہیں۔ ہمیں کیا۔ باقی ہینٹنگز دیکھو“۔ فرزانہ کچھ بوری

ہوتے ہوئے بولی۔

”ہاں ہاں ہینٹنگز دیکھو“۔ آصف نے جلدی سے فرزانہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

تینوں قدرے اور آگے بڑھے۔

”بائے داوے مس قوس قزح آج تمہاری انگلی پر ڈائمنڈز کا ڈھیر نظر نہیں آ رہا“۔ آصف

حسب عادت اسے چھیڑنے لگا۔

”اسلئے کہ میری منگنی ٹوٹ گئی ہے اور انگوٹھی میں نے اتار دی ہے“۔

کچھ فاصلے پر کھڑے بظاہر ہینٹنگ پر نظر سے جمائے فخر عالم کے کان کھڑے ہو گئے۔

”دیکھو اب انکار مت کرنا پلیز! اب تو منگنی کا بہانہ بھی نہیں رہا۔ مس فرزانہ آپ ہی

میری سفارش کر دیں۔ میری تو سنتی ہی نہیں“۔

”کیا؟“ فرزانہ اس کے لب و لہجے پر ہنس دی۔

”کب سے میں درخواستیں دے رہا ہوں کہ مجھ غریب پر نظر کرم فرما کر مجھ سے شادی

کر لے مگر یہ ہے کہ سنتی ہی نہیں“۔

”کیوں دھنک۔ کیوں نہیں سوچتی ہو اسکی پروپوزل پر“۔

”آپ بھول رہی ہیں میں آیا نہیں لایا گیا ہوں“۔ وہ مسکرایا۔

”You — naughty boy.“۔ انہوں نے عجیب سی نظروں سے اسکی

آنکھوں میں دیکھا۔

اور۔ فخر عالم اسکی نظریں نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے ایک ہینٹنگ کو دیکھنے لگا۔

دھنک ایک قدم اور آگے بڑھی۔ باقی ہینٹنگز دیکھنے۔

پھر جانے کیسے؟ دھنک کو اپنے بال کھچنے سے محسوس ہوئے۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ فخر عالم اسی

کے پیچھے کھڑا ایک ہینٹنگ بغور دیکھ رہا تھا اور دھنک کے چند خوبصورت بال اس کے کوٹ کے

بٹن میں الجھ کر رہ گئے تھے۔

وہ پریشان سی اپنے بالوں کو دیکھنے لگی۔

”Your Highness! آپ کے بٹن میں اس لڑکی بچاری کے بال اٹک گئے ہیں“۔

بیگم جہانگیر بڑی ادا سے کہتے ہوئے اس کے بال فخر عالم کے کوٹ کے بٹن سے الگ کرنے لگیں۔

تبھی کہیں جا کر فخر عالم کو ہوش آیا۔ ایک نظر جیسے نہ چاہتے ہوئے بھی دھنک کی بڑی

بڑی ہیزل آنکھوں میں جھانکا اور پھر جیسے اپنی مسکراہٹ بمشکل دباتے ہوئے اپنے بٹن اور

دھنک کے بالوں کو سلجھتے ہوئے دیکھنے لگا۔

”لڑکی خوبصورت تھی“۔ وہ دونوں آگے بڑھے تو بیگم جہانگیر کی آواز سنائی دی۔

”شاید“۔ فخر عالم نے لا پرواہی سے کہا۔

”مگر حضور تو بڑے غور سے اسکی آنکھوں میں جھانکے تھے“۔

”اب آنکھیں ہیں بھٹک گئی ہوگی۔ میں کیا کر سکتا ہوں“۔ وہ خوبصورتی سے مسکرا رہا تھا۔

بیگم جہانگیر کو جیسے فخر عالم کا دھنک کی آنکھوں میں دیکھنا اور پھر انکی بات کے جواب میں

کئی گئی بات اچھی نہ لگی، چہرے پر چپ سی ابھرائی۔

اور۔ دھنک سوچنے لگی کہیں آصف بیگم جہانگیر کے یہاں ڈنر پر ان دونوں کے بارے

میں صحیح تو نہیں کہہ رہا تھا؟

”ہاں“۔ اس نے مختصراً کہا۔

”ویسے You are great اس کے اتنا کچھ کرنے پر بھی اسے معاف کر دیا“۔ بیگم جہانگیر بولیں۔

فخر عالم نے کچھ بھی کہے بغیر لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

تو فریدہ امیریکہ میں تھی۔ جسے فخر عالم اکیلا نظر آتا تھا!

اور۔ اسکی غیر موجودگی میں خالی وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ بیگم جہانگیر کیساتھ گھومتا

پھرتا تھا۔ بہر حال۔

اسے کیا وہ کچھ بھی کرتا؟ یا اسکا مسئلہ نہیں تھا۔ فریدہ کو واپس آ کر اپنا پرانہ سنبھالنا چاہیے تھا۔

”دھنک، دھنک۔ مسٹر عالم اب مجھے گھور رہا ہے“۔ وہ بھر دھیر سے بولا۔

”تو میں کیا کروں“۔ اسے ہنسی آگئی۔

”شادی کر لو مجھ سے۔ پھر یوں نہیں گھورے گا“۔

”اچھا بابا“۔

”کیا مطلب؟“ وہ خوش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”شادی کرنے کو کہہ رہے ہوتا“۔

”ہاں“۔

”کر لوگئی“۔

”مجھ سے“۔ اسے اندیشہ تھا اسکے ذہن میں کوئی اور نہ ہو۔

”ہاں ہاں تم سے“۔

اور فخر عالم نے پھر ایک سرسری نظر دونوں پر ڈالی۔

”بھئی میں تو جاتا ہوں ادھر سے۔ یہ مجھے چھوڑ دینا نہیں“۔

اور آصف واقعی دوسری طرف نکل گیا۔

تبھی۔ فخر عالم اسکے پاس چلا آیا۔

”تو تم بھی اسکی سائیڈ لینے لگیں“۔ وہ اپنی نوٹ بک میں کچھ پوائنٹس نوٹ کرتے ہوئے

بولی۔

”ظاہر ہے تمہارا کوئیگ ہے میرا بھائی ہے“۔ اب تک وہ دھنک کے ناطے آصف کو کئی

بار مل چکی تھی، بات چیت کر چکی تھی۔

اور۔ دھنک دونوں کو خشکیوں سے دیکھتے ہوئے فخر عالم اور بیگم جہانگیر کو درمیان

میں چھوڑ کر ان سے آگے بڑھ گئی۔

آصف جھٹ سے وہاں جا پہنچا۔

”ایسے کام نہیں چلے گا۔ آج فیصلہ کرنا ہوگا“۔ وہ اسکا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا چیز ہو، ہٹو آگے سے“۔

”اول ہوں۔ مجھے جواب چاہیے“۔

”کیا بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو“۔ وہ توجیح گلے بڑ گیا تھا۔

جبکہ وہ یہ بھی سمجھ رہی تھی وہ یہ سب مذاق کر رہا تھا، عام حالات میں وہ اسکی بہت عزت

کرتا تھا۔

”میں تمہیں بچہ دکھائی دیتا ہوں“۔

اور جانے کیوں؟ فخر عالم نے اسے بری طرح گھورا۔

”باپ رے“ آصف کٹنی سہلاتے ہوئے دھنک کے سامنے سے ہٹ کھڑا ہوا۔

”یہ۔ یہ جو مسٹر فخر عالم ہے۔ اسکا یا تو تم سے کوئی کنکشن ہے یا مجھ سے کوئی پیر ہے“۔ وہ ہنسی

آواز میں بولا۔

دھنک دھیر سے مسکرا دی۔ ضرور فخر عالم نے نظروں ہی نظروں میں اسے تنبیہ کی تھی۔

معا سے خیال آیا اسکی بیوی کہاں تھی؟ اور یہ بیگم جہانگیر کب سے اسکی چہیتی بن گئی تھیں؟

”فریدہ ابھی تک امیریکہ میں ہی ہے؟“ بیگم جہانگیر نے بڑا بروقت سوال کیا تھا فخر

عالم سے۔

اس پر کیوں اتنا عجب ڈال رہا تھا؟ حق جتنا رہا تھا؟ آصف سے کیوں اتنا جھلس تھا؟
تمام راستہ وہ یہی سوچتی آئی۔ رات بستر پر لیٹی تو بھی رات گئے تک یہی تانے بانے
جتی رہی۔

جانے کیوں وہ کچھ سہمی گئی۔ آس پاس دیکھا فرزانہ بھی نہیں تھی۔ بیگم جہانگیر بھی شاید
کہیں اور نکل گئی تھیں۔

”آئندہ میں تمہیں اس لڑکے کیساتھ نہ دیکھوں۔“ اسکی آنکھیں چنگاریاں اگل رہی تھیں۔
”وہ... وہ میرا کولیگ ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ لیکن دوبارہ وہ تمہارے پاس بھی پھٹکا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”آپ... آپ میرے معاملات میں کیوں بولتے ہیں۔“

”میں... میں... تمہارا گدہ دباؤنگا کسی دن۔“ اس کی آواز نیچی تھی۔ مگر بلا کا غضب تھا۔

لب ولجے میں۔

”آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے۔“ وہ سنبھل گئی تھی، طنزیہ لہجے میں بولی۔

”میں حق لیا نہیں کرتا۔ استعمال کرتا ہوں۔“ اسکی بات میں چٹان کی سی مضبوطی تھی۔

بڑے بڑے قدم اٹھاتا وہ آگے بڑھ گیا۔

اور دھنک مفلوج سزاہن لئے خالی خالی نظروں سے دیوار پر آویزاں تصویر کو دیکھنے لگی۔

کتنا وقت گزر گیا وہ وہیں دیوار سے نگی سوچوں میں گم کھڑی تھی۔

”دھنک مبارک ہو تمہاری پینٹنگ دوسرے نمبر پر آئی ہے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے۔“

ڈیزیز زندہ اور ماحول جیتا جاگتا لگ رہا ہے اور یہی ایک تصویر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔“

دھنک سوچوں سے ابھر آئی۔

”سچ کہتی ہو؟“

”تو اور کیا۔ تم اس طرف تو آؤ۔ یہاں چپک کر رہ گئی ہو۔ اپنی تصویر کے چہرے تو سنو۔“

فرزانہ اور دھنک کچھ دیر اور وہاں رہیں اور پھر بعد آصف کے تینوں واپس لوٹ آئے۔

فرزانہ اور دھنک بس سے اور آصف اپنی بائیک پر۔

فخر عالم کیا اپنی شادی سے مطمئن نہیں تھا؟ اس کی بیوی امیریکہ اور وہ یہاں تھا۔ پھر بیگم

جہانگیر بھی موقع سے قائدہ اٹھاتی نظر آتی تھیں۔ مگر۔

سو ساری ساری
ڈاکٹ
کام

READING
Station

میں رپورٹر ہوں۔ آپ کے اور آپ کے پھولوں کے متعلق لکھنا چاہتی ہوں۔
 ”اچھا اچھا“۔ وہ بہت خوش ہوا۔ ”مگر بیٹی آج تو تمہیں یہاں کسی بھی دکان پر پھول
 نظر نہیں آئیں گے۔“

”کیوں؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

”شہر کے رئیس فخر عالم صاحب کی سالگرہ ہے۔ شہر کی تمام دکانوں سے پھول آرڈر پر
 منگوائے ہیں۔“
 ”اوہ۔“

اور اسے بہت کچھ یاد آیا۔ پہاڑ پر اسکی سالگرہ، مسکور کن باتیں، بحر زدہ ماحول اور صرف
 وہ دونوں!

آج شاید اسکی سالگرہ زور شور سے منائی جا رہی تھی۔ شاید فریڈہ واپس آگئی تھی اور یہ
 اسکی خواہش پر ہو رہا تھا۔ یا پھر وہ مناتا ہی اسی طور تھا اپنی سالگرہ۔ بہر حال۔
 آج وہ پھولوں کی ان گنت دکانوں میں سے پھولوں کے ڈھیر اٹھالے گیا تھا۔
 مہک رہا ہوگا اسکا ہال۔ اور۔

اس نے سر جھٹکا۔ وہ تلخ یادوں کو یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”اچھا بابا۔ آپ مجھے پھولوں کے بارے میں کچھ بتائیے۔“ اس نے اپنی نوٹ بک
 کھولی۔

”بیٹی! پھول بڑے پیمانے پر ملک کے خاص حصوں مثلاً حیدرآباد وغیرہ سے آتے ہیں۔

وہاں بڑے بڑے بیوپاری اس کام سے وابستہ ہیں۔ حیدرآباد کے آس پاس اور اندرونی

سندھ کے گاؤں میں پھولوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ یہاں لمبے چڑے علاقے پر پھیلے

ہوئے فارموں پر کئی من چنبیلی، موتیا، گیندا اور دیگر قسموں کے پھولوں کی کاشت ہوتی ہے۔

یہ پھول صرف زیورات کیلئے ہی نہیں بلکہ انہیں خوشبو یا عطریات بنانے کیلئے استعمال کیا

جاتا ہے۔ ملک سے باہر بھی بھیجا جاتا ہے۔ اس استعمال کے بعد جو پھول بچ جاتے ہیں انہیں

دن دیرے دیرے کھسک رہے تھے۔ دھوپ کی چھین میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔
 لمبے لمبے دن کا شادو بھر ہو گیا تھا۔

آج اس نے گلفروشوں کی طرف جانا تھا۔

آصف کسی ضروری کام میں مصروف تھا۔ اسلئے فونو گرائی بھی اسکے ذمے لگا رکھی تھی سو۔
 وہ اکیلی ہی اس طرف چل پڑی۔

گندم کی کٹائی جاری تھی۔ کہیں کٹ چکی تھی، کہیں گھٹوں کی شکل میں پڑی تھی، کہیں اب
 بھی سنہری بالیاں لہرا رہی تھیں۔

بس کی کھڑکی میں سے باہر نظریں جمائے وہ چلی جا رہی تھی۔

گلفروشوں کی دکانوں سے وہ پہلے بھی اکثر گزر چکی تھی۔ یہاں پھولوں کے ڈھیر ذہن کو
 معطر کر دیتے تھے۔ کلیوں اور پھولوں سے بنے سہرے مہکتے تھے۔ ایک طرف گجرے اور کنگن
 لٹکے نظر آتے تھے۔ کئی لوگ چابکدستی سے پھول پروانے میں مصروف نظر آتے تھے۔ رنگ
 برنگے گلہ تے بنتے تھے۔ اور یہ سب چیزیں مختلف مواقع پر استعمال ہوتی تھیں۔

وہاں پہنچی تو۔ دکان خالی خالی سے نظر آئے۔

ایک سے دوسری اور پھر تیسری دکان میں گئی۔

”بابا۔ آج دکانیں خالی نظر آ رہی ہیں کیا بات ہے۔“ وہ وہیں بوڑھے گل فروش کے
 پاس بیٹھ گئی۔

”کیوں بیٹی کیا چیز چاہیے؟“

”کچھ نہیں بابا۔ میں پولیس والوں کی طرف سے آئی ہوں۔ میں ایک رسالے کے دفتر

ٹھیکیدار کو بیچ دیا جاتا ہے۔ پھر یہ ٹھیکیدار ان پھولوں کو مقامی گل فروشوں کو بیچ دیتے ہیں۔“

”بابا آپ نے کب سے یہ کام شروع کیا ہے؟“

”بیٹی میں گل فروشوں کے اس کاروبار میں تیسری نسل ہوں۔ میرے باپ دادا بھی پھول بیچتے تھے۔ پھولوں کے زیور بنانے کا فن مجھے ورثے میں ملا ہے۔“

کچھ اور بھی پوائنٹس لیکر اس نے بوڑھے گل فروش اور اسکی خالی ہی دکان کی تصویریں بھی

اتاریں اور پھر۔

اس سے اجازت طلب کرتے ہوئے گھر لوٹ آئی۔

فرزانہ کیساتھ کھانا کھاتے ہوئے آج ایک بار پھر وہ اداس تھی۔ ابھی اسکی آزمائشوں

کا سلسلہ جاری تھا۔ بھول کیوں نہیں پاتی تھی اسے؟

لیکن۔۔۔ وہ تو کوشش کرتی تھی۔ فخر عالم یا اسکا ذکر ہی آٹھتا تھا کہیں نہ کہیں سے۔

اچانک اسکا دل چاہا نکل بھاگے یہاں سے۔

دور جہاں نہ فخر عالم ہو نہ اسکا ذکر!

پر۔ کہاں؟

اپنا پروفیشن بھی تو اسے عزیز تھا!

گھروالوں کی ہزار مخالفتوں کے باوجود وہ اس لائین میں آئی تھی۔ کیا پتہ تھا حالات یوں

کروٹ بدلیں گے۔ وہ زندگی تک سے اکتا جائیگی۔

کیا باہر نکلتی چھوڑ دے؟ مگر کب تک؟ اور پھر آفس سے نکل کر جس بس سٹاپ پر وہ

بس کا انتظار کرتی تھی پہلے نہ سہی اب تو وہ اکثر و بیشتر اسی طرف سے گزرنے لگا تھا۔ اور اگر وہ

ایسا نہ بھی کرتا تو آصف کیا کم تھا اسکا تذکرہ لے بیٹھنے کیلئے!

آج وہ آفس میں بھی گم سم تھی۔ کہ زندگی جیسے عذاب بن کر رہ گئی تھی، جینا دو بھر ہو گیا تھا!

ہمارے دن کی جھک جھک کے بعد جب وہ تھکے تھکے قدموں سے فلیٹ کے اندر گھسنے

گئی تو نظری کے خط پر پڑی۔ اٹھا کر وہ ساتھ اندر لے گئی۔ فرزانہ آچکی تھی۔ کھانا گرم کر رہی

تھی۔ اس نے بھی کپڑے بدلے اور خط لے کر کھانے کی میز پر آ بیٹھی۔ خط کھولا۔

وہی ہر سال کی طرح چند دن کی چھٹی لیکر پہاڑ پر آ جانے کی دعوت!

دل ٹھنڈا، ہریالی اور سرسبز پہاڑوں کیساتھ اچھلا تو ضرور مگر۔ پھر وہی فخر عالم سے

بڑبھیڑ کا خدشا!

اور کھانے کے بعد اس نے امی کو لکھ دیا وہ اس شرط پر جائیگی کہ اس بار وہ پہاڑ کے کسی

اور گاؤں جا کر قیام کریں۔ بہت دیکھ چکے تھے اس گاؤں کو۔

امی ابو کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ نہ سہی پاس والا گاؤں سہی۔ ماحول تو وہ ہی تھا۔

فوراً نیلیم کا جواب آ پہنچا۔ امی کو اسکی شرط منظور تھی۔

اس نے بھی دس دن کی چھٹی کی درخواست دے ڈالی۔ کہ شاید یوں ہی کچھ من بہل

جائے۔ اس ماحول سے دور رہ کر۔ اس شام دہرے پرے جا کر!

آج بھی وہ سیل بھر پر پکنک منانے گئے تھے۔ سڑک کے کنارے گاڑی لگا کر وہ لوگ کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کر اوپر درختوں کے جھنڈ میں جا بیٹھے تھے۔
کچھ دیر کارڈز وغیرہ کھیلتے رہے۔ پھر کچھیلی جانب ڈھلان، کھائی اور کھائی میں بھری کھرا نظارہ کرتے رہے۔ تصاویر اتاریں۔

یہ جگہ اس گاؤں سے پانچ میل کی دوری پر تھی۔ قدرے بڑا قصبہ تھا۔ ڈپسٹری، پبلک کال آفس اور اچھی قسم کے دو ایک ہوٹل بھی تھے۔ بل کھاتی سڑک پر آتی جاتی گاڑیاں، بازار قدرے بڑا اور ضرورت کی ہر چیز میسر تھی۔ ٹورسٹ بھی اسی نسبت سے زیادہ تھے اور رونق بھی۔ انہوں نے ایک اچھا سا سوٹ اوپر اونچائی پر پورے سیزن کیلئے لے لیا تھا۔ خوشی خوشی سامان لگایا۔ تب تک امی کھانا تیار کر چکی تھیں۔ کھانا کھا کر ٹیلم اور دھنک دونوں باہر آمدے میں کرسیوں پر بیٹھ کر چاروں اطراف کا نظارہ کرنے لگیں۔
”ہاتھی۔ یہ جگہ واقعی اس سے اچھی ہے۔“ ٹیلم شال اچھی طرح کندھوں پر لپیٹتے ہوئے

پھر واپس آ کر کھانا کھانے لگے۔ کہ وقت بھی تھا اور کھانا ٹھنڈا ہو جانے کا خدشہ بھی! مٹر پلاؤ، بھنا قیما اور پراٹھے۔ خزا آ گیا!
کھانے کے بعد سب نے قمر سے گرم گرم چائے پیالیوں میں لی۔ امی اب تو ایک طرف جا کر بیٹھ گئے، ٹیلم اور دھنک عین سڑک کے اوپر آسنے سامنے درختوں سے لپک لگا کر ٹانگیں سیدھی پھیلاتے ہوئے بیٹھ گئیں تاکہ سڑک کیساتھ ساتھ سڑک کے اس پار ڈھلان پر یہاں وہاں بنے مقامی لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گھروندے اور انکار بن بہن بھی دیکھ سکیں۔

یوں۔
”اسی لئے تو میں نے لکھا تھا۔ بس ایک ہی جگہ بار بار جاؤ پور ہو جاتا ہے بندہ۔“ جبکہ وہ چھوٹا سا گاؤں اسے اب نہیں برسوں سے پیارا تھا۔ نہ زیادہ ٹورسٹس کا شور، نہ سڑک پر گاڑیوں کے دھوکے، اور پھر بڑے ہوٹل نہیں بھی تھے تو کام چل سکتا تھا۔ بھلے پبلک کال آفس نہ تھی۔ ایک خستہ حال ٹیلیفون ایکس چینج تو تھا۔ سب سے بڑھ کر ایک سکون تھا۔ گہرا سکون!

ڈھلان پر نظریں جمائے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پی رہی تھی۔ تبھی سامنے والے موڑ پر ہلکے سے ہارن سے محویت ٹوٹی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف دیکھنے لگی۔
موڑ کاٹتے ہوئے ایک جیب سامنے آئی اور۔ جس شخص سے فرار ڈھونڈتی وہ یہاں تک آئی تھی۔ وہ آہستہ رفتار سے جیب چلاتا چلا آ رہا تھا۔
پھر دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر صرف وہ ہی نہیں جیسے وہ بھی بے قرار ہوا تھا۔ پرکشش چہرے پر سائے سے لہرائے تھے۔ دلنشین آنکھیں گھاسیل سی لگنے لگی تھیں۔ اور پھر جیسے۔
بے قراری کی جگہ غصے نے لے لی۔ چہرے کے سايوں کی جگہ بیزاری نظر آنے لگی۔ گھاسیل آنکھوں میں وحشت اترنے لگی۔

مگر۔ انکی قسمت میں سکون کہاں تھا؟

اب تو وہ ہفتہ بھر اس قصبے میں چینج ڈھونڈنے آئی تھی۔ ٹھنڈ تو تھی کم از کم۔ شہر کی طرح جھلسا دینے والی گرمی تو نہ تھی۔

کیوں تھا ایسا؟ کیا وہ ابھی تک فریدہ سے ایڈ جسٹ نہیں کر پایا تھا؟
وہ اب بھی جیسے اسے چاہتا تھا۔ اسکا پہلا انداز یہی کہہ رہا تھا۔ بعد میں ان جذبوں کی جگہ غصے اور وحشت نے لے لی تھی۔ جیسے اس پر غصہ آ رہا ہو۔ بہر حال۔

دن اچھے برے گزر رہے تھے۔ وہ اپنے آپکو ٹیلم امی اور ابو کیساتھ مصروف رکھتی۔ کبھی کھانا پکاتی کبھی دوسرے کاموں میں ہاتھ بٹاتی کبھی سب کیساتھ پکنک پر نکل جاتی۔

بانہوں میں لے لیا۔

”کل دوپہر کا کھانا تم نے میرے ساتھ کھانا ہے۔“ آنٹی نور جہان کی آواز اسکے کانوں میں پڑی۔

اس نے سر اور بھی بانہوں میں بھینچ لیا۔ امی نے یقیناً حامی بھر لینی تھی اور وہ۔

فخر عالم کے اس قدر قریب نہ جاسکتی تھی۔ اس علاقے میں قدم قدم پر اسے وہ ہی نظر آتا تھا۔ بھول جانا چاہتی تھی وہ اسے۔ بھاگ جانا چاہتی تھی کہیں۔

اسی جگہ۔ جہاں نہ فخر عالم ہونہ اسکی موجودگی کی توقع اور نا ہی اسکا ذکر!

”کھانے کا تکلف کیوں کرتی ہو ویسے بھی آئیگے۔ کوئی غیر تو ہیں نہیں ہم۔“ امی کی

آواز جیسے دور سے آرہی تھی۔

”تم بھی ضرور آنا بیٹی۔ یہ لوگ تو آ ہی جاتے ہیں تمہارا ہاتھ لگنا مشکل ہوتا ہے۔“ وہ

یقیناً اس سے مخاطب تھیں۔

اس نے بانہیں کھول لیں۔ سر میں اب بھی الجھل تھی۔ چہرہ کھلایا کھلایا۔

تھکی تھکی نظریں اٹھا کر وہ آنٹی کی طرف دیکھنے لگی۔

”آنٹی۔ آپ میری طرف سے معذرت قبول کر لیں۔ میں پھر کبھی آؤنگی۔“ اسکا لہجہ

بھی تھکا ہارا تھا۔

”تو پھر پہاڑ پر آؤ گی اور پھر میرے یہاں آؤ گی۔ یعنی پورے ایک سال بعد۔ تا بابا۔

کل ہی آنا پڑیگا۔ ویسے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ خود ہی اپنے آگے میز پر لگی چائے

اس کیلئے پیالی میں نکالنے لگیں۔ ”لو گرم گرم پی لو۔ طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔ اور ہاں۔ آنا ضرور

ہے۔ میں انتظار کرو گی۔“

اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے حامی بھرنا پڑی۔ اسکے دل میں آنٹی نور جہان کیلئے خاص

جگہ تھی۔ زیادہ انکار کی گنجائش نہ بننا پائی۔

”باجی۔ یہ آدمی جانتا تھا آکھو؟“ نیلم کو ایسا ہی لگا۔

”معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے جانتا ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی شخص کو جانتے ہیں اس

نے ہمیں دیکھا تک نہیں ہوتا۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ وہ شخص تو ہمیں اچھی طرح جانتا ہے

ہم ہی نا واقف ہوتے ہیں۔ صحافت کا پروفیشن ہی ایسا ہے۔“ اس نے بات بنائی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ نیلم خالی کپ ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

اور۔ دھنک نے سوچا یہاں سے وہ کہاں چلی جائے؟

دوپہر کو قدرے آرام کرنے کے بعد وہ اٹھی منہ ہاتھ دھو کر امی کی طرف آئی تو دیکھا آنٹی

نور جہان آئی بیٹھی تھیں۔ فخر عالم کی دریا پار پڑوسن!

”بڑا ہی نیک شخص ہے۔ اتنے جنگلات اتنی املاک ہیں کہ گنتے تھک جاؤ مگر ذرا بھی

جو غرور ذرا بھی جو بڑائی ہو اس آدمی میں۔“

جانے کس کی بات کر رہی تھیں وہ؟

”السلام علیکم آنٹی۔“ وہ اندر داخل ہو کر انہیں گلے ملی۔

”جستی رہو بیٹی۔“ انہوں نے اسے ماتھے پر پیار کیا۔ ”خوش رہو آؤ بیٹھو۔“

وہ اگلے قریب بیٹھ گئی۔

”کس کی باتیں ہو رہی تھیں؟“ اس نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”ارے وہ ہمارے مشرقی طرف والے سینڈ کی۔ اسکے مالی کی بیٹی میرے سکول میں داخل

ہوئی ہے۔ بہت تعریف کرتی ہے۔ اس وقت بات سے بات نکلی تو زبان پر ذکر آ گیا۔ تمہاری

امی نے کامران کی بات بتائی تو خیال آیا ہر بڑا آدمی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ بعض دولت والے

چھوڑے ہوتے ہیں اور بعض اعلیٰ ظرف کے حامل۔“

اور۔ دھنک سوچنے لگی۔ یہ آدمی ہم میں سے ہر ایک کے حواس پر کیوں چھا گیا ہے؟

اسکی کپٹیاں جلنے سی لگیں۔ سر کے اندر جیسے شور سا ہونے لگا۔

اور پھر اس نے وہیں کونے میں بستر پر لیٹ کر سر کے اندر کی الجھل کم کرنے کے

"بیٹے تم نہیں جاؤ ہمارے ساتھ۔ ابھی بھی بخار ہے۔ مانتا ہے رہا ہے۔ چلی گئیں تو اور طبیعت خراب ہوگی۔ ہم بس جلدی ہی آجائیں گے۔ اب دودھ کیا ہے تو برا لگتا ہے۔ تمہاری طرف سے معذرت کر لو گی۔ اور ہاں تمہیں ٹھنڈی ہی گئی ہے..."

وہ آگے بڑھ کر الماری میں دوائی تلاش کرنے لگیں۔ پھر پکن سے گرم دودھ گھاس میں لائیں۔

"اشھو بیٹا"۔ انہوں نے اسے سہارا دیا۔ "یہ کھالو۔ صرف بخارا تارخوالی دوا سے میرا خیال نہیں کہ تم ٹھیک ہو جاؤ یہ بھی ساتھ لے لو"۔ انہوں نے اسے ایک کپھول کھلا دیا۔

اسنے بچوں کو پالا پوسا بڑا کیا تھا۔ چند ضروری اور فوری طور پر دینے والی دواؤں کا استعمال تو وہ بھی جانتی تھیں۔

اسے لحاف اچھی طرح اوڑھا کر کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ باہر نکلے گئیں۔

"بس کھانا کھاتے ہی چل پڑینگے"۔ امی ٹکر مندی بولیں۔

"امی آپ فکر مت کریں۔ ٹھنڈی تو لگی ہے۔ دوائی سے ٹھیک ہو جائیگا سب"۔ اس نے امی کو تسلی دی۔

کچھ دیر یوں ہی بستر میں تھکی رہی۔ بخار پھر سے چڑھنے لگا تھا۔ اٹھ کر اس نے ایک بار پھر گولیاں لیں۔ پھر بستر میں لیٹی۔

تھکی تھوڑی دیر بعد اسے پسینہ آنے لگا۔ طبیعت ہلکی محسوس ہونے لگی۔

اٹھ آئی بستر سے۔ الجھن ہو رہی تھی پڑے پڑے۔

منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ سرسری سے ہال درست کئے، گلچے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی اور تھکی تھکی ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔

برآمدے میں سے سامنے دیکھا سرسبز ڈھلان، پھر سڑک، اور سڑک کے کنارے دکانیں، لوگوں کی گہما گہمی۔

ڈھلان کی چمکند ٹی پر دیرے دیرے چلتی وہ نیچے اتر گئی۔ اپنی رو میں وہ گہما گہمی سے

رات بھر وہ کروت پر کروت ہدلی رہی۔ سر بخاری ہو رہا تھا۔ جسم میں سخت درد۔ شاید اسے بخار ہو گیا تھا۔

جوں توں کر کے سج ہوئی۔ اسکی نبض تیز تھی۔ آنکھیں۔ جل رہی تھیں۔ غالباً ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ اٹھتے ہوئے وہ ہاتھ رو م گئی۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ پکن میں گئی۔ سب میز کے گرد بیٹھے ہاتھ کر رہے تھے۔

اس نے بھی گرم چائے کا کپ لیا۔

"ہاتھ کیوں نہیں کرتیں بیٹا"۔ امی بولیں۔

"امی سر میں بہت درد ہے۔ ہاتھ کو دل نہیں کر رہا"۔

"کیا بات ہے بیٹا۔ ٹھیک تو ہوتا"۔ ابو نے اسکے کہلائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

ساتھ ہی اسکی نبض تمام لی۔ جنہیں تو بخار ہے"۔ وہ تشویش سے بولے۔

"ہاں لگتا ہے ابو مگر ٹھیک ہو جائیگا۔ مجھے لگتا ہے ٹھنڈ لگ گئی ہے"۔ اسکالب دلچسپ بھی تھا

تھا ساتھ۔

"ہاتھ میں کچھ لے لو اور بخار کی گولیاں کھالو"۔ ابو نے کہا۔

"جی اچھا ابو"۔

دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے لایٹ سا ہاتھ کیا۔ گولیاں لیں۔ سب کیساتھ بیٹنے کی کوشش کی۔ مگر سخت تھکی تھکی ہی تھی۔ دوبارہ آکر بستر میں لیٹ گئی۔

بارہ بجے امی ابو اور فلیم آنٹی نور جہان کے یہاں جانے کیلئے تیار ہو رہے تھے۔

امی اسکے پاس آئیں۔ اسکا ہاتھ چھوا اب بھی گرم ہو رہا تھا۔ اسکی سانسیں تیز چل رہی

تھیں۔

”ہاں“۔ وہ تھکی تھکی سی بولی۔

”تو پھر اتنی بارش میں گھومنے کا شوق کیوں چرایا۔“

اسکے لب دلچہ میں اسکے لئے کیر تھی، Concern تھا۔

صدیوں بعد جیسے اسکی باتیں اسکے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔

”بستر میں پڑے پڑے طبیعت گھبرانے لگی تھی۔“

”کب سے بخار ہے۔“ اس نے بلا جھجک اسکی بغض دیکھنے اسکا ہاتھ تھام لیا۔

دھنک نے دھیرے سے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ کہ یہ رشتہ اب اسکا فریڈہ کیساتھ ہونا

چاہیے تھا۔

”شاید کل سے۔“ وہ مختصر ابولی۔

”اس بار یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟“ پہلے جو اسکی اسٹیٹ کے پاس والے گاؤں میں

آکر قیام کیا کرتے تھے۔“

”بس۔“ اسکے لہجے میں اداسی نمودار آئی۔

”کتنے دن کیلئے آئے ہو۔“

”امی ابو پورا سیزن گزارینگے میں دو دن بعد چلی جاؤنگی۔“

”اگر تمہارا بخار اترتا تو۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولے جا رہا تھا۔

وہ مسکرا دی۔

”نہ بھی اترتا تو۔“

”کیوں؟“

”ڈیوٹی ڈیوٹی ہے۔“

”Oh, I see...“

گھر قریب آچکا تھا۔

مذ ”تھینک یو دیری میچ۔“ وہ اترنے لگی۔

مخالف سمت چل دی۔

ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی۔ کہ ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔ اسے احساس ہوا یوں بخار

کی حالت میں یہاں تک آکر اس نے اچھا نہیں کیا۔ اور پھر اوپر سے بارش جو لچکوں میں ہی

تیز شکل اختیار کر گئی تھی۔

تبھی وہ چونکی کسی نے جیب اسکے قریب روکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بارش

سے بچانے کی خاطر اندر آنے کو کہہ رہا تھا۔

”آؤ۔ بھیگ رہی ہو۔ میں پہنچا دوں گا۔“ خلاف توقع اور جیسے مدتوں بعد اس میں اسے

پرانا فخر عالم نظر آیا۔

”لو تھینک یو۔ میں چلی جاؤنگی۔“ بخار کی حدت سے اس کی شرجی آنکھوں میں سرخ

ڈورے بہت واضح ہو رہے تھے۔ اور خود وہ نڈھال ہی لگ رہی تھی۔

اسکی حالت دیکھ کر فخر عالم کو پہلے کی طرح غصہ نہیں آیا۔

”آؤ۔ تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

اس نرم رویے پر جانے کیسے وہ مزید انکار نہ کر سکی۔ اور شاید یہ بھی تھا کہ بخار ہونے کی

وجہ سے وہ اپنے میں اتنی بارش میں گھر پہنچنے کی ہمت بھی نہیں پار ہی تھی۔

کچھ کہے بغیر ہی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ فخر عالم نے دروازہ بند کر دیا۔

گاڑی واپس موڑ کر سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کرنے لگا۔ اسے شاید معلوم تھا کہ وہ

لوگ مخالف سمت میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

”کیسی ہو؟“ وہ اب بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔ عرصے بعد نرمی برت رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے نقاہت سے سر سیٹ کی بیک سے

نکادیا۔

”Looks to me like you have fever.“ ایک نظر اسکے بچکے

کپڑوں پر ڈالتے ہوئے وہ پھر سامنے دیکھنے لگا۔

”Take care of your self.” وہ دھیرے سے بولا۔

اور۔۔۔ دھنک نے سوچا اُسے کیوں اب بھی اسکا خیال تھا؟ پرواہ تھی؟

کاش ایسا نہ ہوتا۔ پھر شاید وہ بھی اس کیلئے اتنی بے قرار نہ رہتی۔

بات شاید دونوں طرف اسی طرح تازہ تھی جیسے کچھ عرصہ قبل تھی۔ جیسی تو باوجود کوشش کے

وہ اسے بھول نہیں پار رہی تھی۔

آج وہ معمول سے بہت کراں سے نرمی سے خوشگوار سے پیش آیا تھا۔ اور اسکا بھی

روپیہ ساری رات بخار کیساتھ ساتھ اسے مزید تڑپاتا رہا۔

کل اس نے واپس جانا تھا۔ اسکا بخار اب بھی ٹوٹا نہیں تھا۔ کمزوری اب بھی اپنی جگہ تھی۔

مکڑیوں بھی ڈیوٹی تھی۔ کام کا حرج ہو رہا تھا۔

ہاں اس وقت بخار کیلئے دوا لینے سے فرق ضرور آ گیا تھا۔ جسم ہلکا اور طبیعت کا جو مصل بہن

جاتا رہا تھا۔

دن کے دس بج چکے تھے۔ اس نے بلو پرنٹڈ پیارے سے کپڑے پہنے۔ آف واہیٹ جیکٹ

اور سفید جوگرز پہنے خوبصورت بالوں پر برش کیا اور۔۔۔

گھر کے سامنے والی سرسبز ڈھلان کی گنڈنڈی پر نیچے اترنے لگی۔

”امی میں ذرا اپنے آفس فون کرنے جا رہی ہوں۔“

امی وہیں ڈھلان پر گھاس پر رکھی کرسی پر بیٹھیں دوپہر کھانے کیلئے سبزی کاٹ رہی تھیں۔

”جاؤ بیٹا۔“ وہ اسکے حسین سراپے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولیں۔ بخار نے اسے کافی

کمزور کر دیا تھا۔

وہ پبلک کال آفس میں ڈیوٹی پر بیٹھے آپریٹر کو اپنے آفس کا نمبر دیکر ایک طرف ہو کر

کھڑی ہو گئی۔

”اے بیٹی! قوس قزح ہی ہونا۔“

جانی پہچانی سی آواز کان میں پڑی تو وہ چونک اٹھی۔

بھلے اسے دھنک سے قوس قزح بنا دیا تھا۔ پر تھیں وہی فخر عالم کی ماما۔ پاس کھڑیں چشمہ

درست کرتیں اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔

پہلی بار انہیں ہل شیشن پر دیکھا تھا۔

”ماما آپ“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں بیٹی میں“ ہاتھ میں پکڑی نوکری بچے فرش پر رکھتے ہوئے وہ اسے گلے لگا کر بار بار اسکا ماتھا چوم رہی تھی۔
 ”مہرے کہاں رہ گئی تھی۔ کہاں کہاں تمہیں چکے چکے ڈھونڈتی رہی۔ خدا یا شکر ہے تیرا میری بیٹی مجھے مل گئی۔“ وہ آنکھوں میں آئے آنسو پلو سے پونپنے لگیں۔
 ”ماما بیٹیس پلیز! اس نے انیس وہیں ایک کرسی پر بٹھایا۔“ آپ ٹھیک تو رہیں اتنا عرصہ یہاں آچکے پہلی بار دیکھا ہے۔ کیسے آتا ہوا آپ تو وہیں شہزادہ کی کوشی میں ہوا کرتی تھی...“

”ٹھیک ہی رہی بیٹا۔ اور یہیں تو اسلئے آئی ہوں کہ فخر عالم لہا کیلا ہوتا ہے۔ کیسا دلگے ہے میرا پچا کیلانہ کیسے۔ ضد کر کے ساتھ چلی آئی۔ اب تو جہاں وہ ہوگا وہاں میں ہوگی بس...“
 ”میزم بات کریں۔ رنگ جا رہی ہے۔“ آپ بڑھک سے مخاطب ہوا۔
 ”بات کر کے سا بھی آئی ملنا۔“ وہ اس طرف بڑھی۔
 ”تھوڑی سی دیر میں بات کر کے وہ دوبارہ اگلے پاس آگئی۔
 ”آئیں ملنے کھٹے چلے ہیں آپ اپنا کام بھی کر لیں گی اور ہاتھ بھی ہوتی رہیں گی۔“
 ”ہاں بیٹی۔“ انہوں نے جلدی سے نوکری اٹھالی۔
 ”دھک نے انہیں میز می اترنے میں مدد دی۔
 ”زیادہ کام نہیں ہے بس کچے اخروٹ لینے تھے۔ بہت اچھا ہوتا ہے اسکا تیل۔ ماش کروگی اپنے بچے کے سر میں۔ پریشانیاں مارے دے بری ہیں دشمنوں کو۔ دو ایک دن سے تو لور بھی باڈا ہوا ہے۔ کھا میرا نام رو گیا ہے۔ کہتا ہے تھوڑا کھانا اچھا ہوتا ہے۔ فٹ رہتا ہے بند۔ پتہ ہے مجھے سب مجھے بہانے کو کہا ہے...“
 وہ اگلے ساتھ دکان میں گئی۔ انہوں نے امیر سارے کے تازہ تازہ اخروٹ خریدے۔
 ”اس سے دونوں آگے پڑے گی۔“

”بیٹی۔ فخر عالم بہت اکیلا ہے۔ اسے اپنالو۔ اسکا دکھ بانٹ لو...“

”ماما فریڈ وا میریک سے واپس کیوں نہیں آجاتی؟“

”ارے تم کو اسے۔ گند ہمتا دور رہتا اچھا ہے۔“

”مگر وہ فخر عالم صاحب کی بیوی تو ہیں نا...“

”کیا؟“ وہ وہیں سچ راستہ میں رک گئیں۔ ”کیا مطلب؟“

”ماما آپ کہتی ہیں میں انہیں اپنالوں... تو... ایک بیوی کی موجودگی میں یہ سب کیسے

ممکن ہے؟“

”ارے بیٹی کا ہے کی بیوی؟ اسکی شادی ہی کب ہوئی ہے؟“

”کیا؟“

”یہ ضرور ہے کہ ساری باتیں فریڈ وا پر ثابت ہوگی جس میں اس نے ایک ایک بات کا اقرار

کر لیا تھا۔ گاڑی کے بریک اسی نے ٹل کر دوائے تھے۔ اسی طرح سکیمنگ میں دھکا بھی اسی

نے کسی آدمی سے دلوایا تھا۔ یہی بات دوہائی میں بھی ثابت ہوئی تھی مگر فخر عالم نے اسکی ہر بات

مخالف کر دی۔ کہتا تھا کچھ بھی ہونالہ زرا ہے اور ہر جگہ جگہ باتوں کے چہرے ہونگے۔ ہاں

شادی سے صاف انکار کر دیا۔“

دھک ششدری کھڑی بن رہی تھی۔

”لیکن۔۔۔ وہ تو ہمارے گھر آئی تھی اتنی دور۔۔۔ یہ بتانے کہ میں انکی شادی میں رکاوٹ

بن رہی ہوں ورنہ کبھی کی ان دونوں کی شادی ہو چکی ہوتی اور یہ بھی کہ اگلے بنتے انکی شادی

ہو رہی ہے...“

”سب جھوٹ بولا ہے۔ کوشش میں ضرور لگی تھی کہ ہو جائے رخصتی مگر۔۔۔ جب گولیوں

کی رپورٹ آگئی اور ثابت ہو گیا کہ زہر ملی تھی۔ سب غم ہو گیا۔

زہر ملی گولیوں اور ہائی سب ہاتھوں کے اقرار کے بعد دن رات رونا کر فخر عالم سے

معاذوں مانگتی تھی۔ رخصتی کا کہتی تھی۔ فخر عالم سخت پریشان تھا۔ یہ انکی دونوں تمہارے گھر کی

معاذوں مانگتی تھی۔ رخصتی کا کہتی تھی۔ فخر عالم سخت پریشان تھا۔ یہ انکی دونوں تمہارے گھر کی

معاذوں مانگتی تھی۔ رخصتی کا کہتی تھی۔ فخر عالم سخت پریشان تھا۔ یہ انکی دونوں تمہارے گھر کی

"ماما۔ جب میں آخری بار آپ لوگوں کے یہاں آئی تھی۔ اور وہ دوا کی دالی ہات ہوئی تھی۔ اسکے بعد جب میں اپنے لٹیک پر گئی۔ تمام حالات کا بغور جائزہ لیا۔ تو میں گھبرا گئی۔ مجھے فخر عالم صاحب سے مزید تعلق رکھنا بہت مشکل بلکہ ممکن سا لگنے لگا۔ انکا نکاح ہو چکا فریدہ قانونا ناکی بیوی تھی۔ پھر مجھے لگا۔ کچھ ہاتھ فخر عالم صاحب کا اسکو پسند کرنے میں یہ بھی تھا۔ میں ان دونوں کے بیچ آ گئی تھی۔ یہ سوچ کر مجھے اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا۔ اور پھر اچانک۔۔۔

ایسے لگا جیسے میرے ارد گرد جال سے بنا دیئے گئے تھے۔ اور میں ان میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ اپنا راستہ کھونٹتی تھی۔

فخر عالم صاحب شادی شدہ تھے۔ انکے گھریلو مسائل بہت الجھے ہوئے تھے۔ پھر ایک طرف فریدہ تھی۔ انکے فکر کی بھی۔ دوسری طرف میں ایک ڈال کلاس بڑکی۔ ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

یہی سب سوچ کر میں نے غصی لے لی۔ گھر چلی گئی۔

یہاں مجھے اپنے اور فخر عالم صاحب کے درمیان اور بھی قاصدے لے کر آنے لگے۔ اتنے۔ کہ جنہیں عبور کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

میں مانتی ہوں میں انہیں بہت مشکل وقت میں چھوڑ کر گئی تھی۔ مجھ اپنا آپ خود غرض بھی لگا تھا مگر۔۔۔ ان حالات کا سامنا کرنا بھی مجھے ممکن نظر آ رہا تھا۔

انکا نکاح نہ ہوا ہوتا۔ تب بھی کوئی بات تھی۔ تب میں شاید یہ مشکل کا مقابلہ کر سکتی۔ لیکن فریدہ پہلے سے انکی منگودہ تھی۔ یہ سوچ کر مجھ اپنا آپ پور بھی خود غرض تھتے لگا۔ بس۔۔۔

میں فخر عالم صاحب کو بتائے بغیر ہی گھر چلی گئی۔ انہوں نے وہاں فون کیا۔ تو میں نے اہیہ وہ فون کرنے سے منع کر دیا۔ پھر انکا مٹا آیا۔ میں نے اسکا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔

اسکی خونہسورت آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"ماما میں نے بڑی مشکل سے دل کو سمجھایا تھا۔۔۔ کہ اتنے میں فریدہ آ گئی۔ بولی۔ تم

ہوگی۔ تمہیں اپنے راستے سے ہٹ جانے کو کہا ہوگا۔ بہر حال۔۔۔ فخر عالم نے اس سے دو ٹوک بات کر لی۔ طلاق بھی دیدی۔ کہا میری طرف سے آزاد ہو۔ جس سے چاہو شادی کر سکتی ہو۔ پھر وہ امریکہ چلی گئی۔ اب سنا ہے وہیں اپنے ایک پرانے ہائے فیڈ سے شادی کر لی ہے۔۔۔ ہائے فیڈ سے یقیناً ماما کی مراد ہوائے فریڈ تھا۔

"ماما۔۔۔ وہ پہلے ہی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نڈھال تھی۔ اوپر سے اتنے عجیب و غریب انکشافات۔۔۔" آئیں یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔ بخار ہے مجھے۔

"ہاں بیٹی رنگ سفید پڑا ہوا ہے۔ بیٹھ جاتے ہیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔" دونوں پندرہ مرہک کے اوپر چڑھ کر گھاس پر بیٹھ گئیں۔ دھتک نے قرعہ درخت سے پشت نکالی۔

پھر ماما نے اسے شروع سے لیکر آج تک کی ساری باتیں بتا ڈالیں۔ اور یہ بھی کہ فخر عالم کے سچ کرنے کے باوجود وہ جگ جگ اسے چھپ چھپ کر مومڑتی رہیں۔

"فخر عالم کہتا تھا تم اس سے بات کرنے سے کتراتے تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ اس سے طو۔ سو وہ بھی اب تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ ایک دو بار میں نے دبے لفظوں

میں تمہارا پتہ فون نمبر وغیرہ پوچھا بھی مگر تمہیں اسکا قصہ معلوم ہے۔ پھر میں اپنے چیل تمہیں دہرا دہرا مومڑتی رہی۔۔۔ اور بیٹی! یہ کامران سے تمہاری منگنی کا کیا قصہ ہے؟" ماما کو

جیسے اچانک خیال آیا۔ "ایک رات فخر عالم بیگم جمانگیر کے یہاں ڈنر سے واپس آیا تو جیسے پاگل ہو رہا تھا اسے۔ آتے ہی کامران کو فون کیا۔ برس پڑا اس پر۔ گالیاں تک دے

الیں۔ بعد میں اس پچارت نے مجھے فون پر کہا۔ کہ اتے کیا معلوم تھا کہ فخر عالم اس میں لپکی لپکتے۔۔۔ ہتہ کس انکار تہے نا تھا۔۔۔"

دھتک میرے سے مسکرائی۔ تو انکا اندازہ کج نکلا تھا!

"اچھا بیٹی تم کوئی فخر عالم سے دوسری بیٹی نہیں؟"

ہمارے درمیان نہ آتیں تو کب کی ہماری شادی ہو چکی ہوتی۔ تم فخر عالم کی دولت کے پیچھے لگی ہو۔ جلد ہی ہماری شادی ہو نوالی ہے...

پھر اسی شام ایک بار پھر فخر عالم صاحب کا فون آیا۔ پتہ نہیں کیوں انکی باتوں سے مجھے لگاؤ بھی آخری فیصلہ کرنا پڑتا ہے تھے جیسے۔ رسم پوری کرنا چاہتے تھے محض! وہاں آئی تو اپنے کو لیک نے بھی بتایا کہ فخر عالم صاحب نے اپنی کزن سے شادی کر لی ہے۔

بعد میں فخر عالم صاحب اکثر وہی بستر نظر آئے۔ اکا دکا بات بھی ہوئی۔ وہ اکثر غصے میں ہوتے۔ مجھے حیرت بھی ہوتی کہ اب تو انکی شادی ہو چکی تھی انہیں خوش و خرم ہونا چاہیے تھا بجائے اس کے کہ مجھ پر برسی پڑتے۔ وہ قدرے رکی دم لیا۔ "پھر ہمیشہ اکیلے ہوتے۔ یہ بھی جیسا کہ مگر پیٹنگ کی ایک فائش پر ان کیساتھ بیگم جیا تگمیر کی باتوں سے پتہ چلا فریوہ ہمہ یکس ہے۔ خیال آیا شادی کے بعد گئی ہے..."

دہر تک وہ نور ماما باتیں کرتی رہیں۔ ہر بات ششے کی طرح صاف اور واضح ہوتی چلی گئی۔ دھنک کی ساری غلط فہمیاں ایک ایک کر کے دور ہوتی گئیں۔

توہر جینی اب تو کسی نواب کی بیگم نے چھانٹ رکھا ہے۔ فون پر فون آتے ہیں۔ بہانے بہانے بھی گھومتی ہے۔ کبھی خود چلی آتی ہے۔ "دھنک دھیرے سے مسکرا دی۔

"اے جینی تم مسکرا رہی ہو۔ میں تو کبھی ہوں مارڈالوں اس گنہگار کو بھی۔" وہ پھر سے جلال میں آ گئیں۔

"تو نہ سنا کر نہ فون نہ جیبا کریں۔ اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تو انکی پر مرضی ہے۔" انکی مرضی پر تم ہوسرں تمہا اگر تم نے اسے سنبھالا نہ دیا تو وہ پھر جیسا کہ اتنا میں بتا دوں۔" ایک بار پھر وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اسے شام دو بارہ لپہ لپہ نے آ لیا تھا۔ غناہت سے آنکھیں موندنے ہوئے پر وہ لپہ سے لپہ آیا۔

"چلو جینی تمہیں پہنچا آؤں۔ جھک گئی ہو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں ماما چلوں گی اب۔ شاید پھر سے بتا رہے ہوں گے۔" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماما نے اسے قریب ہی اسکے گھر چھوڑا اور خود کچھ مطمئن مطمئن ہی خوش خوش چل دیں۔

گرم گرم دودھ میں اوڈلین ڈال کر اس نے پیا۔ اپنی دو اینیاں لیں اور بستر میں گھس گئی۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند کہاں؟

ماما کی باتیں ایک ایک کر کے اسکے ذہن میں گونجتی رہیں۔

"جینی۔ فخر عالم بہت اکیلا ہے۔ اسے اپنا لوبا اسکے دکھ بانٹ لو۔

اگر تم نے اسے سنبھالا نہ دیا تو وہ پھر جیسا کہ اتنا میں بتا دوں۔

پھر چند روز قبل پتک پر فخر عالم کا وہاں سے گزرنا یاد آیا۔

اسے دیکھ کر جیسے وہ بے قرار سا ہوا تھا۔ پرکشش چہرے پر سائے سے لہرائے تھے۔ آنکھیں گھٹائی گئی تھیں۔ اور پھر۔

جیسے بے قراری کی جگہ فصرہ نے لے لی تھی، پرکشش سائوں کی جگہ بڑھاری نظر آنے لگی تھی اور گھٹائی آنکھوں میں وحشت مہماکنے لگی تھی۔

اس نے تب بھی اندازہ لگایا تھا جیسے وہ اب بھی اسے چاہتا تھا مگر حالات پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ بہت زیادہ! وہ بولے سے مسکرا دی۔

شام کی چائے کے بعد وہ تیار ہوئی۔ آف وائسڈ پر چھوٹے چھوٹے سبز پھولوں والے کپڑے پہنے۔ آف وائسڈ فوٹو صورت لٹلی سویٹر لور اسی کے ہمرنگ لیڈر کے شوز پہنے۔ لائیسڈ بڑاؤن فوٹو صورت بالوں پر برش کیا۔ کپڑوں پر اپنا پسندیدہ ہلکون سپرے کیا۔ اور باہر نکل آئی۔ سب برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

"آن آپ لوگوں کا بچہ ہانے کا کوئی پروگرام نہیں؟" اس نے پوچھ ہی لیا۔ وہ تینوں

کاہل آج بھی پرکشش دکھائی دے رہا تھا اور۔۔۔ مجھ پر نہ مائل میں سے مجھ میں تگر آتمیں
 مدد م روٹھنیاں آج بھی پراسرار لگ رہی تھیں!
 پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔ ارد گرد دیکھنے لگی۔
 تبھی۔ ایک طرف سے ماما آگئیں۔

"تم آگئیں بیٹا"۔ ماما خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

"ہاں ماما"۔

"اندراؤ۔ فخر عالم اپنے بیڈروم میں ہے"۔

"جی"۔

وہ ماما کیساتھ ہوئی۔

"میں نے اسے تمہارے بارے میں سب بتا دیا ہے"۔ ماما پتے پتے بولیں۔

وہ خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

بڑے سے ہال میں سے ہوتیں وہ دونوں خوبصورت کارپنڈ بیڈروم میں چلے گئیں۔

فخر عالم کے بیڈروم تک پہنچ کر ماما اداس مڑنے لگیں۔

"ماما... دھنک پہلی ہار جھک سی رہی تھی۔"

"جاؤ بیٹی جاؤ"۔ ماما آہستہ سے بولیں اور۔۔۔

بیڈروم کی طرف بڑھ گئیں۔

دھنک نے دروازے پر ہولے سے دھنک دی۔

"ہیں"۔

وہ دھنک کے دل کیساتھ اندر داخل ہوئی۔

Luxurious اور آرام دہ کمرے میں Love seat پر بیٹھ کر فخر عالم کوئی کتاب

پڑھنے میں منہمک تھا۔

آہٹ پر چونکتے ہوئے اس نے کتاب آگے سے اٹالی۔

جو بہت اطمینان سے بیٹھے تھے۔
 "ہاں بیٹے۔ اس وقت امت نہیں ہے"۔ امی بولیں۔ "تمہیں بھی تو بخار تھا..."
 "اس وقت نہیں ہے امی"۔ اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ کہ امی اسے بخار میں ہرگز ہاہر
 جانے نہ دیتیں۔

"امی میں ذرا اپنی ایک دوست کے پاس جاؤنگی۔ یہیں پاس ہی رہتی ہے"۔ اگر وہ
 پھیل کا ذکر کرتی تو پھر بھی وہ جانے نہ دیتیں۔

"ہو آؤ بیٹا۔ طبیعت بہل جانے کی گھر... تمہارا بخار ابھی ٹوٹا نہیں ہے... وہ اسکے
 کمرے سے چرے پر نگر ڈالتے ہوئے متذہب سی بولیں۔

"امی کل واپس جاؤنگی۔ تو ڈاکٹر کو دکھا دوںگی۔ اس وقت میرا جانا ضروری ہے۔ پلیز
 امی؟" وہ امی کے پاس ہی کھڑی تھی۔ محبت سے انکے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"جاؤ بیٹا۔ مگر جلدی آنے کی کوشش کرنا مجھے فخر لگی رہے گی"۔

"کوشش ضرور کروں گی امی۔ لیکن... اگر دیر ہوگی تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں..."

دیر تو ہوتی تھی۔ بس سے جانا۔ کچھ دیر وہاں رہنا اور پھر واپس!

بس سے اترتے ہوئے وہ شورٹ کٹ پر ہوئی۔

جلدی ہی اس جگہ پہنچی مئی۔ جہاں دریا کی چوڑائی کم اور بڑے بڑے پتھر ہوتے تھے۔

پھر جہاں سے وہ پہلے بھی سبکی دریا کراس کر چکی تھی۔

شام نہال ہو رہی تھی۔ اونچے اونچے سرہانے پائیز میں ڈھیر سارے سفید ہادل آنکھ

کھل رہے تھے اور جھلک کے چچ میں سے گزرتی تھیں کھانی ہنسل روڈ کے دونوں طرف

ہیٹارنگ لائٹس گہرے کمرے میں ساتے کی ہنسل بنتی نہ ہی کر رہے تھے۔

وہ آگے آگے جھکی گئی۔

جہاں گھبراہٹ آج بھی نہ کھڑے نھر آ رہے تھے۔ گھر کے آگے بنا پھونسا کھڑی

بھڑکی۔ وہ اسے سیٹ پر لے آیا۔ آہستہ سے اٹا دیا۔ کٹن سر کے نیچے دیئے۔ اور کبیل
اوزهادیا۔

”میں تو خود تمہارے پاس آ رہا تھا۔ مگر تم نے پہل کی ہے مجھے اور بھی اچھا لگا۔“ وہ انٹر
کوم کارپیسور اٹھاتے اٹھاتے خوشگوار سے بولا۔

اس نے کچن میں کوئی آرڈر کی۔ اور واپس آ کر اسکے پہلو میں بیٹھ گیا۔

ایک ہل کو اسکی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

پتہ نہیں کیا تھا اسکی آنکھوں میں؟ دھنک کی پلکیں جھک گئیں۔ چہرے پر حیا کی لالی بکھر

گئی۔

فخر عالم بہت مہلوظ ہوا۔ آج وہ ایک پریس رپورٹر سے عام لڑکی بن گئی تھی!

”بائے داوے کل تم واپس نہیں جا رہی۔ اسے معلوم تھا کل اس نے ڈیوٹی پر جانا تھا۔

”کیوں؟“ وہ پھر سب بھول بھال گئی۔ نظریں اٹھا کر اسکی طرف دیکھنے لگی۔

”اسلئے نیم۔ کہ آج رات میں اور ماما تمہارا ہاتھ مانگتے تمہارے چہرے کے پاس

جا بیٹھے۔ کل انشاء اللہ ہمارا نکاح ہوگا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے آؤنگا۔ اور جب تم

بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تو ہم ایک شاندار ولیمہ دینگے۔ اور یوں ہماری شادی ہو جائیگی...“

اسکا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہو گیا۔

”اور یہ سارا پروگرام آپ نے خود ہی بنالیا۔“ وہ سنہلنے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ مجھے کون روک سکتا ہے۔“

”اور... میں...“

معاذ ووازے پر دستک ہوئی۔ اور دھنک کی بات اور صوری رہ گئی۔

فخر عالم اسکے پاس سے اٹھتے ہوئے بالکنی کے قریب رکی۔ حیرت لاکر اسکی نزدیک بیٹھ گیا۔

قوم کوئی کیڑے لئے اٹھ رہا تھا۔ برتن اسکے قریب میز پر رکھے اور واپس چلے دیا۔

دھنک اٹھ کر بیٹھ گئی۔

دھنک اب بھی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

ایک لمبو فخر عالم کی آنکھوں میں تھپتھپیس سی جل اٹھیں۔ مگر دوسرے ہی ہل نارنگی ہو کر

آئی۔ کیسے بغیر کچھ متائے اسے چھوڑ گئی تھی۔ کتنا کتنا پریشان رہا تھا وہ۔

دھنک کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ماما کہ اس نے غلط کیا تھا مگر اب تو آگئی تھی!؟

کوئی ریسپانس نہ پا کر دوسوٹی لڑھک کر اسکے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

اور سنہلتے ہوئے فخر عالم نے اپنے دونوں بازو اٹھ کر دیئے۔ وہ اسکے آنسو نہیں دیکھ سکتا

تھا۔

تھکی تھکی دو آگے بڑھی۔ فخر عالم نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ سینے سے لگا

کر چہرے قرار آنے لگا۔

”کہیں جلی گئی تھیں مجھے چھوڑ کر ہاں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گا۔“

اسکے سینے ہالوں میں چہرہ چھپائے وہ میرے دیرے دیرے کہتا گیا۔ ”اب میں ایک ہل بھی تمہیں

اپنے سے الگ نہیں کرونگا۔ چھوڑ جاتی ہو، مگر ہو جاتی ہو، جیسی زہر ملی باتیں کرتی ہو...“

دھنک رو رہی تھی۔ پچھلیاں لے لنگر رو رہی تھی۔ بہت دکھ اٹھانے کے بعد آج اسکا کندھا

طاقتور رکھے کوشاید اسلئے۔

”روؤ نہیں پلیز!“ اس نے اسکا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ”اب تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔“ اس

نے اسکا آنسو اپنے ہاتھوں پر اٹھالینے۔

م۔۔۔ چہرہ۔

”تمہیں تو اب بھی نہیں بچ ہے۔ آرام کی ضرورت ہے تمہیں۔“

اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر وہ بیڈ کی طرف چلا۔

”یہاں پلیز!“ دھنک نے قریب ہی بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ مگر بویا۔

”تمہیں آرام سے لیٹ نہیں سکو گی؟“ صرف وہ بندوں کی تو سیٹ تھی۔

”جسہیں کیا ہوا؟“ وہ جان بوجھ کر پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں۔ اور میں نے آپ سے شادی نہیں کرنی۔“

”ک۔ کیوں؟“

”آج آپکی بیگم جہانگیر ہیں۔ کل کوئی اور ہوگی...“ اس کے لہجے میں شکوہ تھا، حکایت تھی۔

”میری آج بھی تم ہو اور کل بھی تم ہوگی۔ بیگم جہانگیر کہاں سے آئیں۔“

”آپ لائے ہیں۔ مجھے کیا پتہ۔“

”Let's don't discuss her.“ بلکہ آج کسی اور کی بات نہیں ہوگی۔ صرف

میری اور تمہاری بات ہوگی۔ ٹھیک۔“

”ہاں۔“ دھنک نے مصدومیت سے سر اثبات میں بلا دیا۔ ”آہیہ وہ بھی صرف میری

اور آپکی بات ہوگی۔ کسی اور کی نہیں ہوگی۔“

”آہیہ وہ کی تو میں گاڑنی نہیں دے سکتا...“

”کیا؟“ وہ حیر ہونے لگی۔

”بھئی آہیہ وہ ہم اپنے بچوں کی تو باتیں کر چکے؟۔ میں کیسے وعدہ کروں کہ آہیہ وہ بھی

صرف میری اور تمہاری بات ہوگی۔“

اس کا چہرہ کانوں کی لوڑوں تک سرخ ہو گیا۔

دھنک نے کوئی کا آخری کھونٹ لیا۔ اپنا کپ میز پر رکھا۔

”اب میں چلوں گی۔ کچھ کچھ بہت دیر ہو جائیگی۔“

”ہاں۔ اس وقت میں تمہیں اور نہیں روکوں گا۔ کیونکہ تمہارے گھر میں کوئی اطلاع نہیں

لیکن اتنا رک جاؤ کہ میں اور ماما بھی تمہارے ساتھ چلیں۔ جسہیں چھوڑنے بھی ہانا

ہے۔ اور جسہیں بیٹھ کیلئے ساتھ لانے کی بات بھی کرنی ہے تمہارے سٹیشن سے...“

”آج ہی کر لیں گے بات۔“ دھنک جگ سی رہی تھی۔ اس کے ہانے سے کہیں امی اب

بکھڑا ہانے سب۔

فخر عالم نے اسے سینڈویچز آفر کئے۔ پھر اس کیلئے کوئی بنانے لگا۔

”میں نے اس سے پہلے کبھی کسی لڑکی کیلئے کوئی نہیں بنائی۔ آج تمہارے لئے بنا رہا

ہوں...“

”چھوڑیں نا۔ بیگم جہانگیر کیلئے تو بنائی ہوگی۔“ دھنک نے لطیف چوٹ کی۔

وہ زور سے ہنس دیا۔

”میں لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ بات چہا چہا کر کہہ رہا تھا۔

دھنک کے حسین چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

”اس کا مطلب ہے بیگم جہانگیر کیلئے بناتے رہے ہیں۔“

”آں... Never ever... وہ میرے لئے بنائی تھیں البتہ۔“

دھنک کو یہ بھی اچھا نہیں لگا۔ چپ سی رہ گئی۔

فخر عالم نے کپ سٹیک آگے رکھا۔ پھر اپنے لئے کوئی بنائی۔ اور کڑوی بلیک کوئی کے گرم

گرم کھونٹ حق سے اتارنے لگا۔

”ہائے واہوے جسہیں انکے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“

”انکے یہاں ڈنر پر... پھر میسٹرز کی نمائش پر... پریس والے کہہ رہے تھے۔“ اس

نے پریس پینڈ اور دیتے ہوئے کہا۔ آصف پریس ہی سے تو تھا۔

”لوہو۔“

”لوہو نہیں۔“

”اب کیا ہوگا؟“ اس نے اپنے موہ پر مصنوعی گھبراہٹ طاری کر لی۔

اور دھنک کھٹکھٹا کر ہنس دی۔

”بہت اچھی کوئی بنائی ہیں ویسے... بیگم جہانگیر...“ فخر عالم نے ایک بار پھر اسے

بکھڑا۔

مسکراتی دھنک خاموش ہو گئی۔

"آپکا انٹرویو لیٹا تھا سر!"

اور۔۔۔ فخر عالم کا جائزہ لیتا ہوا۔

"Yes, but no details. Just three words..."

"کیا؟"

"Fakhr e Alam — The murderer, the drunkard

and the ultimate womaniser."

اور۔۔۔ دھنک کو بہت پہلے ایڈیٹر اشفاق کو فخر عالم کے ہی گھر سے لکھا ہوا خط یاد آ گیا۔

یہی سب تو لکھا تھا اس نے اس میں۔

وہ خفیف سی نظر آنے لگی۔

"آپ... معاف نہیں کر سکتے مجھے۔"

"معافی کیسی۔ یہی سب کرتے ہوئے تو تم مجھے ابھی تک لگے گی جس۔" ہاتھ جوھا کر اس

نے اسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کتنا اچھا تھا وہ!

"اور ہاں۔" اس نے اس کے چہرے پر گہرائی بالوں کی لٹ آہستہ سے اٹھی سے پیچھے

ہٹائی۔ "مگر یہ انٹرویو میگزین کیلئے تمہاری آخری سائیکسٹ ہوگی۔ اب میں تمہیں ایک لمبا کو

بھی اپنے سے الگ نہیں کروں گا۔ سمجھیں..."

"جی۔" اس نے سر آہستہ سے اثبات میں ہلا دیا۔

اور چند ہی روز بعد چیف ایڈیٹر اشفاق اور آصف آفس میں بیٹھے اپنے اپنے ایسے کارڈ

وصول کر کے مسکرا رہے تھے۔

اشفاق صاحب کے نام ایک الگ ریجنٹری بھی تھی۔ اس میں حفاظت سے تہ کے چند

ادرائی کیساتھ دھنک کا ایک ٹکڑا سا خط بھی تھا!

"Don't you worry." ہم تمہیں گھر سے کچھ قافلے پر ڈراپ کر دیں گے۔ جب

تم گھر کے اندر چلی جاؤ گی تو ہم بھی آ جائیں گے... "وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر بولی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" فخر عالم نے اسکی کاپی کی۔ "یہ کوئی بچوں کی Hide and

seek گیم تو نہیں ہے کہ پہلے تم اندر جاؤ پھر ہم آ جائیں گے۔ سیدھے سیدھے ایک ساتھ چلیں

گے۔ رات ہے اندھیرا ہے۔ ہاں تم اپنا میرے پاس آنا چھپانا چاہو وہ الگ بات ہے۔ وہ تم

خود سوچ کر کیا کہو گی۔ جب تک میں تیار ہو کر آتا ہوں۔"

اسے وہیں چھوڑ کر وہ اپنے ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔

اور وہ واقعی سوچنے لگی۔ وہ کہے گی۔ کہ وہ وہاں آ کر بس سے اتری تو یہ لوگ اس طرف

آتے ہوئے راستے میں مل گئے۔ اور اسے لفت دیدی۔

تھوڑی سی دیر میں فخر عالم تیار ہو کر آ گیا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں ہلبوس وہ ہمیشہ کی طرح

Stunning لگ رہا تھا۔

اس نے وہیں سے مانا کو بھی تیار ہونے کا کہہ دیا۔ خود آ کر دھنک کے پاس صوفے پر

بیٹھ گیا۔

ایک لمحے کو اسکی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہائے واوے مس! تمہارا یہاں نزول کیسے ہوا؟ کہاں سے آئیں؟ کس سلسلے میں

آئیں؟" وہ اپنی بہت پہلے کی بات دہراتے ہوئے مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

وہ مس دی۔ خواہ سورتی سے۔

"بڑی جلدی خیالاً؟" اس نے بھی اپنا پرانا ہی جواب دہرایا۔

"پلو اور سے کیا تو دو۔ کون آئی تھی؟ کیسے آئی تھی...؟" اسکی آنکھوں میں اس

وقت بھی طرح سی ہنک تھی جسے کسی بات کہنے ہوئے بہت پہلے تھی۔

وہ مسکرائی۔ ایک لمبا کو کچھ سوچا۔



”اگل میں نے کہا تھا مسز فخر عالم کا اعتراف میں کر دوں گی۔ سو حاضر خدمت ہے۔ آپ
من کر بیٹیا خوش ہو گئے۔ میں نے آپ کا کہا مان لیا۔ بھول آپ کے اپنا گھر سا لیا اور جان
جو کھوں کے کام پھوڑ دئے۔ دم تک۔“

”آپ... آپ... آپ... مجھ سے شادی کر چکے؟“
وہ اپنے فرسٹ کلاس کپارٹمنٹ میں سے اگل کر پتلی سی لیگ وے میں سے گزری رہا تھا
کسا ایک لڑکی نے روک لیا۔

”کیا؟“ وہ جیسا چل کر رہ گیا!

”کاروان کیا تھا ایک چٹا بھرتا مسین آرمادو سنکل بیٹا پارٹمنٹ تھا؟“

”آپ نماز میں پڑھتے ہیں اور کئی کئی گراں فرینڈز لگتے ہیں...“

”In namaz, I bow before my Creator. And in a girl
friend I admire His creation.“

وہ لوگ چلے ہی چلے گئے۔ قصبے اور شہر آتے اور پچھے رہ جاتے مگر ان کا سطر جاری تھا۔ شیر
شاہ کاروان ڈرائیج کرتا سڑک پر نظریں جمائے تھا۔ ”سنگرز سینٹ پر بیٹا اسٹاس سے گپ شپ
کردہ ہوا تھا۔ جس دنوں کو کوئی کی طلب ہوئی۔“

”پلی پلیز! ہمارے لئے کوئی ٹاڈ“ اسد نے رخ پچھنے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

پلی نے مختصر سے خوبصورت مگن میں کوئی ہائی۔ پچھ گھس میں ڈالیں۔ مہولی تیار۔ اسے
گھس ساتھ میں سینڈ وچر رکھا اور۔ فرنٹ سٹیس کی طرف چلی آئی۔

”This is the city of the richest celebrities.“ شیر شاہ نے
اسد سے کہا۔

”ویسے فخرت کرنا اچھا نہیں ہوتا“۔ پلی بولی۔

”کون کا فخرت کرتا ہے؟“

”تو پھر ایک وقت میں تین تین کیسے ہوتی ہیں؟“

”مجھے تینوں اچھی لگتی ہیں۔“

بے حد موزاب دینڈو کی سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ جیسے کوہ پیر ایسی کھنکھو موزاب
تھی اور اسکے جاگ جانے کا اندیشہ تھا۔ آزار میں لے رہے تھے کہ گواہم مدولی ہوئی تو جان سے
ہائیں گے!

اُس کا گھر آسٹا قہل احمد کی مندر طرزِ تحریر میں ایک اور خوبصورت اضافہ ہے۔

پاک سوسائٹی
ڈاٹ
کام



- دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھوڑے پر سوار ہوا، اسے ایڑھ لگائی، تیزی سے مختصر سی چڑھائی طے کی اور اس پار اترتے اترتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
- وہ اسے کسی دیو مالائی کہانی کا شہزادہ لگا۔ خوبصورت، بے خوف اور بہادر!
- مگر... وہ شاہ تھا ہاں نہیں تھا۔ اس نے تلخی سے سوچا کہ وہ جی تو رہا تھا مگر آنکھوں میں وہ بے باکی نہ رہی تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی اور جو ایک باز کی خصوصیت تھی!
- اس وقت پھر شانی کو محسوس ہوا نادیہ اسے قاتح انداز میں دیکھ رہی تھی۔ شہباز خان سے ملنا... ایک پر جلال، مختار کل جہاں پناہ سے ملنا! ایک دنیا فتح کرنے کے مترادف ہی تو تھا!
- ”آپ میں ہی تو وہ سب کچھ ہے جسکی لڑکی تمنا کر سکتی ہے...“
- ”No, No, Please!“ وہ اچانک ہسٹیرک انداز میں کہنے لگا۔ ”میں وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ تم... کچھ نہیں جانتیں میرے بارے میں...“
- نادیہ کو سویت پر چھوڑتے چھوڑتے وہ ایک بار پھر چونکا۔
- بتیاں تو سب روشن تھیں، یہ سویت آج اتنا بے رونق کیوں تھا؟
- دنوں بعد ایک موہومی مسکراہٹ اسکے لبوں کو چھو گئی۔ پڑوسن کے نقوش ہوٹل پر خاے گہرے تھے!

آمنہ اقبال احمد اپنی مخصوص طرز تحریر میں ایک اور ناول پڑوسن پیش کرتی ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



امنا اقبال احمد

کے
قلم سے نکلا ہوا

امنا اقبال احمد
کے
دیگر ناول

لاذکر والہ ناول

پہلے تو دیکھتے دو گھر کے درمیان...
بڑا سا نئے ٹیلا اور اس پر اترتے اترتے گھر ہیں سے اٹھنے لگے۔
وہ اس کی اچھا دکان کوئی کچھ نہیں ہوگی۔ خریدتے بے خوف اور بے...
تو اس کی سب سے بڑھ کر اس کی جو بھی ہو کر ہی سہی سہی...
اگر کتنے خوشی کو سونہ ہوا جیسے ہو گیا ہے۔ اس نے...
شیراز خان سے... ایک پروردگار... اس سے...
تو اس نے کہا کہ تم لوگوں کو تو تھا۔

”آپ میں دوست کچھ ہے جس میں ایک ٹیلا تو آسکتی ہے۔“
”No, No, Please!“ وہ ابا تک سنی تمہارا گھر سے ہے۔
تو وہ نہیں جانے تو تھا۔ تم... کچھ نہیں جانتے ہو کہ اس سے...
زویہ کو دوست پر چھوڑنے پھوڑنے، ایک...
تجربا تو سب داتا جس گھر جانے یہ ہو کہ آنا اس کے وقت سے...
اور بعد ایک روز وہی مسکراہٹ اس کے ہونے لگی تھی۔ اس کے...
بڑی پر فہم گھر تھی۔

شائع ہو گیا ہے

کی تو دنیا بھر سے تمہارے پروردگار کی

اسٹاکسٹ

ناشر

اردو سلاٹ بک کارپوریشن

AKSOCIETY.COM
P: AKSOCI M

ONLINE LIBRARY
CORPAKISTAN